حکومت بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ

فردنامہ-۳

پرویز شاہدی

ڈاکٹر محسن رضا رضوی

Monograph-3

Parwaiz Shahidi

By Dr. Mohsim Raza Rizvi

پرویز شاہدی (۱۹۱۰ء تا ۱۹۶۸ء) ترقی پسند شاعری کے ایک اہم ستون تھے۔ ان کے شعری آفاق میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے چند اہم اردو شاعروں میں جہاں اقبالؔ، فیضؔ اور فراقؔ کا نام لیا جاتا ہے وہیں اس صنف میں پرویز شاہدی بھی بلاشبہ نمایاں ہیں۔ ترقی پسند فنکاروں اور دانشوروں میں ان کا مرتبہ بلند و برتر ہے۔ انھوں نے ہمارے شعری ادب کو نہ صرف تخلیقی سطح پر وقار بخشا، بلکہ اسے ایک نئی فکری جہت بھی عطا کی۔ روایت کی پاسداری، ترقی پسندی، رومانیت اور انقلاب کی ہم آمیزی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انھوں نے ہمارے قدیم طرز سخن کی توسیع کی ہے اور ترقی پسندی کو تازگی اور کشادگی عطا کی۔

اس مونوگراف کے مصنف ڈاکٹر محسن رضا رضوی اردو کے ایک اچھے ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ شعر و سخن سے بھی ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اس سے قبل قاضی عبدالودود (۲۰۰۵ء) اور عطاء اللہ پالوی (۲۰۰۷ء) پر اِن کے دو فردنامے منظر عام پر آچکے ہیں۔ دو شعری مجموعے، 'عکس اشک' (۱۹۸۶ء) اور 'فن ہمارا' (۱۹۹۰ء) کے علاوہ تین تنقیدی کتابیں 'جابر حسین : شاعر، افسانہ نگار' (۲۰۰۱ء)، 'نگاہ و نکات' (۲۰۰۹ء) اور 'علیم اللہ حالیؔ کی نظمیں' (۲۰۱۴ء) بھی شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ترتیب دی ہوئی نصف درجن کتابیں بھی مصنف کے علمیت اور صلاحیت پر دال ہیں۔ امید ہے کہ پرویز شاہدی پر محسن رضا رضوی کی یہ نگارش آپ کو پسند آئے گی۔ فی الوقت ڈاکٹر محسن رضا رضوی اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

پرویز شاہدی

ڈاکٹر محسن رضا رضوی

ناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۳

Parwaiz Shahidi

By

Dr. Mohsin Raza Rizvi

نام کتاب	:	پرویز شاہدی
مصنف	:	محسن رضا رضوی
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	120
کمپوزنگ	:	شہناز بانو
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاءاللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ : 9334020186

ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

- پیش لفظ: امتیاز احمد کریمی ۵
- پرویز شاہدی : ایک معروضی تعارف اسلم جاوداں ۷
- ابتدائیہ : ڈاکٹر محسن رضا رضوی ۱۱

عنوانات

- پرویز شاہدی: ایک نظر میں ۱۴
- **احوال و کوائف** ۱۹
- دادیہالی سلسلہ ۱۹
- نانیہالی سلسلہ ۲۰
- خاندان ۲۰
- پیدائش ۲۴
- تعلیم اور اساتذہ ۲۴
- شاعری کا آغاز ۲۵
- پہلا شعر ۲۶
- پہلا باضابطہ مشاعرہ ۲۷
- تلمذ ۲۷
- تلامذہ ۲۸
- بیعت ۲۸
- عادات وخصائل ۲۹
- وضع قطع ۲۹

- کھیل کود ۳۰
- ترک وطن ۳۱
- ملازمت ۳۳
- صحافت ۳۵
- شادی ۳۶
- اولاد ۳۹
- معاشقہ ۴۲
- بذلہ سنجی ۴۲
- مئے نوشی ۴۲
- سیاسی سرگرمیاں اور قید و بند ۴۳
- اصناف ادب پر قدرت ۴۵
- مضامین ۴۸
- مکاتیب ۴۹
- وفات اور مدفن ۴۹
- **فن** ۵۴
- غزل گوئی ۵۴
- نظم نگاری ۶۳
- رباعی گوئی ۶۹
- نثر نگاری ۷۴
- **انتخاب کلام** ۸۱
- منتخب غزلیں ۸۱
- منتخب نظمیں ۹۶
- منتخب رباعیات ۱۱۶
- کتابیات ۱۲۰

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعروادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی وشعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، فضلِ حق آزاد، شوقؔ نیموی، انجمؔ مانپوری، یاسؔ یگانہ چنگیزی، بیدلؔ عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجزؔ، رضا نقوی واہیؔ، واقف عظیم آبادی، رمزؔ عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعروادب بجا طور ناز کرسکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعروادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی وشعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان وادب کی قدرومنزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری وادبی خدمات کی تفہیم اوران کے شخصی تعارف کے لئے شادؔ عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجزؔ، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہیؔ، وہاب اشرفی، رمزؔ عظیم آبادی، پرویزؔ شاہدی اور شین مظفر پوری پر فردنامے شائع کئے جارہے ہیں۔

پرویزؔ شاہدی (۱۹۱۰ء تا ۱۹۶۸ء) ترقی پسند شاعری کے ایک اہم ستون تھے۔ ان کے شعری آفاق میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے چند اہم اردو شاعروں میں جہاں اقبالؔ، فیضؔ اور فراقؔ کا نام لیا جاتا ہے وہیں اس صنف میں پرویز شاہدی بھی بلا شبہ نمایاں ہیں۔ ترقی پسند فنکاروں اور دانشوروں میں ان کا مرتبہ بلند و برتر ہے۔ انھوں نے ہمارے شعری ادب کو نہ صرف تخلیقی سطح پر وقار بخشا، بلکہ اسے ایک نئی فکری جہت بھی عطا کی۔ روایت کی پاسداری، ترقی پسندی، رومانیت اور انقلاب کی ہم آمیزی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انھوں نے ہمارے قدیم طرز سخن کی توسیع کی ہے اور ترقی پسندی کو تازگی اور کشادگی عطا کی۔

اس مونوگراف کے مصنف ڈاکٹر محسن رضا رضوی اردو کے ایک اچھے ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ شعروسخن سے بھی ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اس سے قبل قاضی عبدالودود (۲۰۰۵ء) اور عطاء اللہ پالوی (۲۰۰۷ء) پر ان کے دو فردنامے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ دو شعری مجموعے، 'عکس اشک' (۱۹۸۶ء) اور 'فن ہمارا' (۱۹۹۰ء) کے علاوہ تین تنقیدی کتابیں 'جابر حسین : شاعر، افسانہ نگار' (۲۰۰۱ء)، 'نگاہ و نکات' (۲۰۰۹ء) اور 'علیم اللہ حالیؔ کی نظمیں' (۲۰۱۴ء) بھی شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ترتیب دی ہوئی نصف درجن کتابیں بھی مصنف کے علمیت اور صلاحیت پر دال ہے۔ امید ہے کہ پرویز شاہدی پر محسن رضا رضوی کی یہ نگارش آپ کو پسند آئے گی۔ فی الوقت ڈاکٹر محسن رضا رضوی اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

امتیاز احمد کریمی

ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

پرویز شاہدی: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

پرویز شاہدی کا شمار بہار کے ان چند بڑے شعرا میں ہوتا ہے، جنہیں بہار کے شعر و ادب کی آبرو کہا جاتا ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں صف اوّل کے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں، وہ ترقی پسند نظریات میں یقین رکھنے والے ایک ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے حاشیے پر پڑے ہوئے لوگوں کے دکھ درد کو اپنی روح میں جذب کیا اور پھر فنکارانہ حسن کے ساتھ اُسے شاعری کا روپ دے کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ زندگی اور فن کے باہمی رشتوں میں یقین رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری انقلابی رومانیت کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ پرویز شاہدی ایک سچے محبّ وطن، سیکولر نظریات اور صحت مند اقدار کے حامل شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اجتماعی شعور سے بھرپور، سماجی انصاف سے محروم دکھی انسانیت کے دل کی آواز بن گئی۔ پرویز شاہدی نے بیک وقت نظم اور غزل دونوں صنفوں کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اُن کی نظمیں جس قدر خوبصورت اور متاثر کن ہیں، ان کی غزلیں بھی اسی قدر فکر و فن کا نادر امتزاج ہیں۔ اس کے علاوہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پرویز شاہدی فطری طور پر ایک رومانی شاعر ہیں؛ اس لیے ان کی شاعری میں کلاسیکی رومانیت واضح طور پر جھلکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بڑی دلکشی اور دِل نشینی ہے۔

پرویز شاہدی کا اصل نام سید اکرام حسین تھا۔ انھوں نے اپنا تخلص پہلے اکرام اور اس کے بعد پرویز رکھا۔ ان کی پیدائش ۲۱ر ستمبر ۱۹۱۰ء (۶ر رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ) کو لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید احمد حسین ضَو اور آپ کی والدہ کا نام عائشہ خاتون تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مولوی منور علی کے زیرِ نگرانی ہوئی اور درس نظامیہ کے تحت آپ دس برسوں تک عربی، فارسی و دیگر علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ ۱۹۲۵ء میں پرویز شاہدی نے ایم ایل جوبلی انسٹی

ٹیوشن سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج (پرانا نام نیو کالج) سے انٹر کا امتحان اور ۱۹۳۰ء میں پٹنہ کالج سے ہی بی.اے.، فارسی آنرز کے ساتھ کیا۔ ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو اور ۱۹۳۵ء میں وہیں سے فارسی میں ایم.اے. کا امتحان پاس کیا۔

پرویز شاہدی کو اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور بنگلہ زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔

ان کی ملازمت کی ابتدا مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے ہوئی اور اس کے بعد مختلف تعلیمی اداروں میں ملازمت کرتے ہوئے آخر میں ۱۹۵۸ء سے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں آپ کمیونسٹ پارٹی سے جڑے اور سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں قید و بند کی زندگی بھی گذاری۔ پرویز شاہدی نے ۲۲-۱۹۲۱ء کے قریب شاعری کی ابتدا کی۔ آپ کا پہلا شعر تھا۔

ایسا نوکر جہاں میں کم نکلے　　خرچ میرا ہوا اُس کا دم نکلے

آپ کی زندگی کا پہلا طرحی مشاعرہ ۱۹۲۳ء میں لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی کا مشاعرہ تھا، جس میں پرویز شاہدی کی غزل کا مطلع تھا ؎

ہاتھ خالی قبر پر وہ کیوں ہیں آنے کے لیے☆کم سے کم دو پھول تو لاتے چڑھانے کے لیے

پرویز شاہدی کی شاعری کا باضابطہ آغاز ۱۹۲۵ء میں پٹنہ کالج میں منعقد مشاعرے سے ہوا، جس میں شاد عظیم آبادی بھی جلوہ افروز تھے۔ پرویز شاہدی کی غزل کا مطلع تھا ؎

نہ پوچھو رو رہا ہوں کیوں نوائے مرغ نسیاں پر☆پریشاں جانتا ہے کیا گزرتی ہے پریشاں پر

آپ نے مولانا عین الہدیٰ ثمر آروی سے باضابطہ شرف تلمذ حاصل کیا، ۶ر نومبر ۱۹۵۵ء کو آپ کی شادی فضیلت النساء بیگم بنت مجیب الرحمٰن سے ہوئی، جس سے آپ کو اکلوتی اولاد سیمینہ (بیٹی) ۲۳ر اگست ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئی۔ ملازمت کے سلسلے میں جب آپ کلکتہ گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ آپ کے معاصرین میں مبارک عظیم آبادی، ثاقب عظیم آبادی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، ہوش عظیم آبادی، ابراہیم ہوش وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

۵ر مئی ۱۹۶۸ء کو اتوار کے دن ۷ر بجے شام میں آپ کی وفات ہوئی اور ۶ر مئی ۱۹۶۸ء کو گیارہ بجے دن میں گوبرہ قبرستان، کلکتہ میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ دبستانِ ادب بہار میں

پرویزؔ شاہدی اپنے کلام کی انفرادیت، کلاسیکی اور رومانی حسن اور متوازن اشتراکی تیور کے سبب نمایاں شناخت اور معزز مقام کے حامل ہیں، لہٰذا ان کی شاعری ایک مبسوط اور مخلصانہ احتساب کی متقاضی ہے۔

تصانیف

(۱) رقصِ حیات (۱۹۵۷ء) (اس میں ۳۵ر نظمیں، ۳۰ر غزلیں اور ۱۴ر رباعیاں شامل ہیں)

(۲) تثلیثِ حیات (۱۹۶۸ء) (اس میں ۹۷ر غزلیں اور ۳۰ر نظمیں شامل ہیں)

انتخاب اشعار

- تضاداتِ سرمایہ داری نے مارا
  شکاری کو آخر شکاری نے مارا
- نہ جانے کہہ گئے کیا آپ مسکرانے میں
  ہے دل کو ناز کہ جان آگئی فسانے میں
- تم 'خنک جذبہ' ہو بے تابیِ فن کیا جانو؟
  کیا گزرتی ہے دمِ فکرِ سخن کیا جانو
- جب تک شریکِ حال کسی کی نظر نہ تھی
  تھی زندگی حسین مگر اس قدر نہ تھی
- چھپ کر نہ رہ سکے نگہِ اہلِ فن سے ہم
  محفل میں جھانکتے ہیں نقابِ سخن سے ہم
- منزل بھی ملے گی رستے میں تم راہ گذر کی بات کرو
  آغازِ سفر سے پہلے کیوں انجامِ سفر کی بات کرو
- اگر گناہ یہی ہے کہ تجھ کو پیار کیا
  تو ہاں گناہ کیا اور بار بار کیا
- افشائے راز کا تجھے ہر دم گماں ہوا
  مجھ سے خطا ہوئی جو ترا رازداں ہوا
- نہ جانے درس گاہوں کو کہاں پہنچا کے دم لے گی
  یہ تعلیمی کج اندیشی، یہ بے سمتی نصابوں کی
- موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
  شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا
- ان پڑھ آندھی گھس آتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
  'اندر آنا منع ہے' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا
- نپٹیں گے دل سے معرکۂ رہ گزر کے بعد
  لیں گے سفر کا جائزہ ختمِ سفر کے بعد
- راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
  ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی
- تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو
  آ جایئے ذرا رُخِ روشن لئے ہوئے
- مرا رنگِ سخن کیا ہے، مری طرزِ نوا کیا ہے
  جبینِ وقت کی تحریر پڑھ لو، پوچھنا کیا ہے

- وعدہ نہیں ہے کوئی مگر ان کا انتظار
  پرویزؔ صبح و شام کئے جا رہا ہوں میں
- اسی زمین میں ہے کتنے آسماں روپوش
  کسی نے فکر نہ کی ماہ و خور اُگانے کی
- جنابِ شیخ ذکرِ خلد میں باتیں بناتے ہیں
  کوئی پوچھے کہ جنت کیوں یہاں بننے نہیں دیتے
- اپنی اپنی روشنی میں آج ہیں شمعیں مگن
  خلوتوں میں بٹ گیا انتشارِ انجمن
- کوئی دیر و حرم کو جا کے میخانے میں ڈال آئے
  نہ حالِ شیخ اچھا ہے نہ حالِ برہمن اچھا
- ماہ و خور اُگانے ہیں کہکشاں بنانا ہے
  اے زمیں تجھے ہی اب آسماں بنانا ہے
- محبت کا جنوں اور وہ بھی اس دنیائے باطل میں
  گہر کی جستجو، میں کر رہا ہوں ریگِ ساحل میں
- سکتے تک آ پہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کربِ سکوت
  ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
- مجھ کو تخریب سے تعمیر کا ملا ہے سبق
  برق گرتی ہے تو روشن مرا گھر ہوتا ہے
- حسرت مری ہیں آپ، مرا مدّعا ہیں آپ
  اے کاش آپ بھی تو سمجھتے کہ کیا ہیں آپ
- اب تری آنکھوں کو نمناک نہ ہونے دیں گے
  دامنِ ناز ترا چاک نہ ہونے دیں گے
- زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہیے
  زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے
- سوچ سمجھ کر اہلِ نظر نے شعلوں کی دنیا کو چنا
  ورنہ نشیمن بن سکتا تھا برق و شرر سے آگے بھی
- دل کا تعاقب کرتے کرتے ہانپ رہی ہے سعیِ ستم
  دار و رسن کیا جا سکتے ہیں گردن و سر سے آگے بھی

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

پرویز شاہدی ترقی پسند شاعری کے ایک اہم ستون تھے۔ان کے شعری آفاق میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے۔ترقی پسند فن کاروں اور دانشوروں میں ان کا مرتبہ بلند و برتر ہے۔انہوں نے ہمارے شعری ادب کو نہ صرف تخلیقی سطح پر وقار بخشا؛ بلکہ اسے ایک نئ فکری جہت بھی عطا کی ہے۔روایت کی پاسداری،ترقی پسندی،رومانیت اور انقلاب کی ہم آمیزی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔انہوں نے ہمارے قدیم طرزِ سخن کی توسیع کی ہے اور ترقی پسندی کو تازگی اور کشادگی سے ہمکنار کیا ہے۔

پرویز شاہدی بقول مظہر امام ناقدوں کے مقتول رہے ہیں۔ایک عام خیال یہ ہے کہ پرویز شاہدی کو ترقی پسندوں میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا،جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔اس کی ایک وجہ محض یہ رہی کہ وہ زمانہ شناس تھے نہ مصلحت اندیش،انہوں نے شہرت اندوزی کے لیے کسی نردبان کا سہارا لیا،نہ ایسا کوئی حلقہ بنایا،جس کے سہارے بامِ شہرت تک جست لگائی جا سکے۔

پرویز شاہدی کا سرمایہ کلام بھی کمیت کے اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں؛لیکن کیفیت اور اثر و تاثیر کے لحاظ سے ان کا ادبی قد اپنے معاصرین میں بہتوں سے بلند تر ہے۔ان پر کسی حد تک کام بھی ہوا ہے،باوجود اس کے ان کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں اور پہلوؤں کا منور ہونا ابھی باقی ہے۔رئیس انور نے اپنی مرتبہ کتاب ''بازیافت پرویز شاہدی'' (۱۹۹۰ء) میں ابتدا سے ۱۹۹۰ء تک پرویز شاہدی کے حوالے سے ہونے والے کاموں کی تفصیل پیش کی ہے۔حالیہ دنوں میں حکومت بہار کے لسانی،ادبی وثقافتی مجلّہ سہ ماہی ''بھاشا سنگم'' (جولائی ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۵ء) نے ''پرویز شاہدی نمبر'' شائع کیا ہے۔اس نمبر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں تا حال پرویز شاہدی

پر مطبوعہ رسالوں کے نمبرات میں شامل مضامین کی فہرست اور ان کے حوالے سے شائع شدہ تصنیفات و تالیفات کا مفصل گوشوارہ شامل کیا گیا ہے، جو پرویز شاہدی پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے اشارہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔

زیرِ نظر مونوگراف میں، میں نے سب سے پہلے ''پرویز شاہدی: بیک نظر'' عنوان کے تحت پرویز شاہدی کی پیدائش سے وفات تک کے اہم واقعات تاریخ وار درج کر دئے ہیں؛ تا کہ تشنگان علم و ادب ایک نظر میں اس نابغۂ عصر سے روشناس ہو سکیں۔

''احوال وکوائف'' کے تحت پرویز شاہدی کی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔آبا و اجداد، ولادت و جائے ولادت ، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ، اساتذہ، شاعری کا آغاز، تلمذ و تلامذہ، بیعت، عادات وخصائل، وضع قطع، کھیل کود، ترک وطن اور کلکتہ ہجرت، ملازمت، صحافت، بذلہ سنجی، مے نوشی، معاشقہ، شادی و اولاد، ادبی و سیاسی سرگرمیاں اور قید و بند سے لے کر وفات و مدفن تک کا قدرے تفصیلی ذکر ہوا ہے۔اپنے خیالات کو تقویت پہنچانے کے لیے میں نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے حوالوں سے بھی کام لیا ہے۔

ایک الگ باب ''فن'' سے متعلق ہے،جس میں ذیلی عنوانات کے تحت غزل گوئی، نظم نگاری، رباعی گوئی اور نثر نگاری سے بحث کی گئی ہے۔

آخر میں ''انتخاب کلام'' ہے، یہاں کوشش کی گئی ہے کہ کلام پرویز کا جامع اور صحت مند انتخاب پیش کیا جائے؛ تا کہ قارئین براہ راست متن سے مستفیض ہوں اور اپنی آزادانہ رائے قائم کر سکیں۔

مونوگراف کی ترتیب کے دوران یہ امر خصوصی طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں پرویز شاہدی کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیا جائے تا کہ متعاقب نسل کم سے کم وقت میں پرویز شاہدی کی شخصیت اور فن کے تمام گوشوں سے آشنا ہو اور ''پرویز شناسی'' کی تفہیم کی نئ راہ روشن ہو سکے۔

میں اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار کے ذمہ داران، خصوصی طور پر ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی کا شکر گزار ہوں، جو دبستان عظیم آباد کے ادبی سرمائے کے تحفظ و فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، انہوں نے منفرد رنگ و آہنگ کے شاعر اور دبستان عظیم آباد کی آبرو پرویز شاہدی پر مونوگراف کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔

مونوگراف کی کمپوزنگ کے لیے عزیزہ شہناز بانو کے لیے دعا گزار ہوں اور متن کی صحت کے لیے اپنے رفیق کار ڈاکٹر قنبر علی کا ممنون ہوں۔

اردو شاعری میں پرویز شاہدی کے مقام و مرتبے کی نئے سرے سے بازیافت میں میری یہ ادنی کاوش اگر بہ نظر استحسان دیکھی گئی تو میں اسے اپنی خوش بختی تسلیم کروں گا۔ امکان غالب ہے کہ بعض امور میری کوتاہی اور نارسائی کے سبب حیطۂ تحریر میں نہ آسکے ہوں۔ کسی بھی قسم کی کوتاہی کی طرف اگر آپ مجھے متوجہ کر سکیں تو عین نوازش ہوگی۔

— محسن رضا رضوی

پرویز شاہدی: ایک نظر میں

نام	: سید اکرام حسین
قلمی نام	: پرویز شاہدی (پردادا و پرنانا دونوں کا نام شاہد حسین ہونے کی مناسبت سے تخلص کے ساتھ 'شاہدی' کا اضافہ)
خاندان	: دادیہال اور نانیہال دونوں جانب سے مختلف واسطوں سے ہوتا ہوا حضرت علی علیہ السلام سے جاملتا ہے۔
وطن	: لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی
پیدائش	: ۲۱ر ستمبر ۱۹۱۰ء (۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ، چہار شنبہ)
جائے پیدائش	: عالم منزل، رانی پور، لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی۔
جداعلیٰ	: سید محمود خنگ سوار (سلطان محمد غوری کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے)
پردادا کے والد	: سید میر واجد حسین (ڈپٹی کلکٹر تھے، انہوں نے باضابطہ طور پر 'سکریچہ' ضلع پٹنہ میں بودوباش اختیار کر لی تھی)
پردادا	: سید شاہد حسین
پردادی	: بی بی بخشن بنت میر احمد علی (رئیس راجگیر)

دادا : سید حامد حسین (ان کی شادی نواب شمس الہدیٰ سی آئی ای رئیس محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی کی دوسری اہلیہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین لڑکے سید احمد حسین، سید عالم حسین اور سید عطا حسین کے علاوہ ایک لڑکی [اہلیہ سید عبدالرزاق، صدر گلی پٹنہ سٹی] کی ولادت ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ وہی نواب شمس الہدی ہیں، جن کے نام پر مدرسہ شمس الہدی اسلامیہ، پٹنہ قائم ہے۔ اس سے متصل ایک مسجد پرویز شاہدی کے والد کے ماموں سید نورالہدیٰ نے تعمیر کرائی تھی، جو آج بھی آباد ہے اور 'نوری مسجد' کے نام سے مشہور ہے)

والد : سید احمد حسین المتخلص 'ضوٗ' (تلمیذ مولانا عین الہدیٰ ثمر آروی، ہیڈ مولوی، پٹنہ کالجیٹ اسکول)

والدہ : عائشہ خاتون بنت حافظ عبدالغفور، رئیس راج گیر، بہار (پرویز شاہدی کے والد کی شادی سیدہ صغریٰ خاتون سے ہوئی تھی؛ لیکن ان کے اچانک قضا کر جانے کے سبب ان کا عقد ثانی سیدہ صغریٰ خاتون کی چھوٹی بہن سیدہ عائشہ خاتون سے ہوا)

بڑے ماموں : سید مظفر الدین المتخلص 'بینا' (نابینا تھے، حافظ تھے، شاعری بھی کرتے تھے)

چھوٹے ماموں : سید عبدالصمد (بی این کالج، پٹنہ میں فارسی کے استاد تھے۔ صبا رشیدی کے نام سے شاعری کرتے تھے، انہوں نے راجگیر سے ایک ادبی ماہنامہ 'فطرت' جاری کیا تھا۔ اس کے کئی شمارے خدا بخش لائبریری، پٹنہ اور نیشنل لائبریری، کلکتہ میں موجود ہیں)

بھائی : صرف دو بھائی تھے، دوسرے سید انعام حسین (حبیب بینک، کراچی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے)

بہنیں : سیدہ ام سلمیٰ راز عرف رئیسہ خاتون (زوجہ مجیب الرحمٰن ایڈوکیٹ، گلاب باغ، پٹنہ)
سیدہ ام سارہ مخفی (زوجہ سید شاہ جعفر حسین ولد خان بہادر نواب شاہ واجد حسین، رئیس خسرو پور، پٹنہ)
سیدہ کبریٰ پنہاں، عرف کبن (زوجہ سید اظہار احمد ولد سید انوار احمد ریٹائرڈ کمشنر انکم ٹیکس، بہار شریف، متمکن کدم کنواں، پٹنہ)
سیدہ ام رسول سوز رشیدہ خاتون عرف رسن (زوجہ سید قیام الدین ایڈوکیٹ، بہار شریف، نالندہ)
سیدہ عالیہ خاتون زریں عرف علن (زوجہ یوسف برکات ولد مجیب البرکات، ریٹائرڈ سیشن جج، ملکی محلّہ، آرہ)

تعلیم/اساتذہ : پہلے باضابطہ استاد مولوی منور علی تھے جن سے درس نظامیہ کے تحت تقریباً دس برسوں تک عربی و فارسی اور دیگر علوم حاصل کرتے رہے، پھر ماسٹر شرف الدین (رانچی) سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۵ء : ایم ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن سے میٹرک (فرسٹ ڈویژن)

۱۹۲۷ء : نیو کالج (موجودہ پٹنہ کالج) سے آئی-اے

۱۹۳۰ء : پٹنہ کالج سے بی-اے (فارسی آنرز)

۱۹۳۴ء : پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (اردو)

۱۹۳۵ء : پٹنہ یونیورسٹی سے ایم-اے (فارسی)

۱۹۳۸ء : کلکتہ یونیورسٹی سے بی-ٹی

بیعت : دس سال کی عمر میں والد کے ہمراہ دلی جا کر سید شاہ منور علی کے سلسلے کے ایک بزرگ شاہ جمیل الرحمٰن چشتی نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

کھیل کود : فٹ بال، ٹیبل ٹینس اور شطرنج سے خصوصی دلچسپی (لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی کی فرینڈس یونین کلب کے کپتان)

زبان سے واقفیت : اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور بنگلہ

شاعری کا آغاز : ۲۱-۱۹۲۰ء کے آس پاس

پہلا شعر : ۱۹۲۱ء میں:

ایسا نوکر جہاں میں کم نکلے
خرچ میرا ہو اس کا دم نکلے

پہلا طرحی مشاعرہ : لوڈی کٹرہ پٹنہ سٹی ۱۹۲۳ء، پرویز شاہدی کی غزل کا مطلع تھا:

ہاتھ خالی قبر پر وہ کیوں ہیں آنے کے لیے
کم سے کم دو پھول تو لاتے چڑھانے کے لیے

پہلا باضابطہ مشاعرہ : نیو کالج، ۱۹۲۵ء (اس مشاعرے میں شاد عظیم آبادی بھی موجود تھے)

نہ پوچھو رو رہا ہوں کیوں نوائے مرغ نسیاں پر
پریشاں جانتا ہے کیا گزرتی ہے پریشاں پر

تلمذ : مولانا عین الہدیٰ ثمر آروی (جانشین صفیر بلگرامی)

ترک وطن : ۱۹۳۵ء

ملازمت : (۱) اوّل اوّل مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں اسسٹنٹ ٹیچر

(۲) اسلامیہ ہائی اسکول، کلکتہ (مارچ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک)

(۳) مدنا پور کالج میں اردو کے لکچرار (۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک)

(۴) سریندر ناتھ کالج میں اردو کے لکچرار (۱۹۴۷ سے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اور اس سلسلے میں قید ہونے تک)

(۵) انجمن بوائز ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر (۱۹۵۰ء کے اواخر سے فروری ۱۹۵۳ء تک)

(۶) سی ایم او ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر (۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک)

(۷) ۱۹۵۸ء سے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستگی (تادم مرگ)

ادارت : ''جدید اردو''، کلکتہ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۹ء)

کمیونزم سے لگاؤ : ۱۹۴۵ء سے تادم حیات

قید و بند : ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء (دم دم اور بکسا نامی جیلوں میں)

شادی : ۶؍نومبر ۱۹۵۵ء (دن کے گیارہ بجے)

اہلیہ : فضیلت النسا بیگم بنت مجیب الرحمٰن

اولاد : سمینہ (اکلوتی بیٹی) ولادت ۲۳؍اگست ۱۹۵۶ء

سمینہ کی شادی : ۱۰؍مارچ ۱۹۸۰ء (ہمراہ طارق منان)

تصانیف : دو شعری مجموعے اور ایک مضامین کا مجموعہ

رقص حیات : مکتبہ شاہراہ، دہلی کی طرف سے جید برقی پریس، بلی ماران، دہلی نے اپریل ۱۹۵۷ء میں شائع کیا، اس میں ۳۵؍نظمیں ۳۰؍غزلیں اور ۴۱؍رباعیاں ہیں۔ مقدمہ ل احمد اکبرآبادی کا تحریر کردہ ہے اور ''اشارات'' کے عنوان کے تحت ۱۲؍صفحات پر محیط ہے۔

تثلیث حیات : ادارۂ لوح و قلم، سرکس رینج، کلکتہ ۱۹ کی طرف سے مطبع اسرار کریمی پریس، الہ آباد نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا، اس میں ۷۹؍غزلیں اور ۳۰؍نظمیں ہیں۔ ۳۳؍غزلیں اور ۹؍نظمیں ایسی ہیں جو پہلے مجموعے میں بھی شامل ہیں۔ ''متاع فقیر'' کے عنوان سے خود پرویز شاہدی کی ۷؍صفحات پر مشتمل تحریر شامل ہے۔

مضامین پرویز شاہدی : مغربی بنگال اردو اکادمی، رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ ۱۶ نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا، اس کی ترتیب کا کام فضیلت پرویز نے انجام دیا، اس میں پرویز شاہدی کے آٹھ مضامین اور بیالیس مکاتیب شامل ہیں۔

معاصرین : مبارک عظیم آبادی، ثمر آروی، بیتاب عظیم آبادی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، ثاقب عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی، بسمل عظیم آبادی، دانش عظیم آبادی، ہوش عظیم آبادی، جرم محمد آبادی، مظہر امام، ابراہیم ہوش، شریف چکوالی، شاکر کلکتوی، سالک لکھنوی، قمر صدیقی، آصف بنارسی، واصف بنارسی، ناوک لکھنوی وغیرہ۔

مستقل پتہ : ۶؍سرکس رینج کولکاتا (موجودہ پرویز شاہدی رینج) ۷۰۰۰۱۹

وفات : ۵؍مئی ۱۹۶۸ء بروز اتوار، ۷؍بجے شام (اپنی قیام گاہ ۶؍سرکس رینج، کلکتہ)

تدفین : ۶؍مئی ۱۹۶۸ء، ۱۱؍بجے دن، گوبرہ قبرستان کلکتہ (نماز جنازہ مولانا کفیل احمد فاروقی نے پڑھائی)

احوال وکوائف

سید اکرام حسین پرویز شاہدی کا سلسلۂ نسب دادیہال اور نانیہال دونوں جانب سے مختلف واسطوں سے ہوتا ہوا حضرت علی کرم اللہ وجہ تک پہنچتا ہے؛ یعنی یہ علوی سید تھے۔ مولوی سید محمد کریم الدین احمد نے اپنی کتاب ''مخزن الانساب'' میں دونوں سلسلے درج کئے ہیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

دادیہالی سلسلہ:

''سید اکرام حسین (پرویز شاہدی) بن سید احمد حسین بن سید حامد حسین بن سید شاہد حسین بن سید واجد حسین بن سید قادر بخش بن سید غلام شرف بن سید غلام یحییٰ بن سید معین الدین بن سید عبدالرحمٰن بن سید زین العابدین بن سید جمال بن سید حسین بن سید عیسیٰ بن سید رکن الدین بن سید منجھن بن سید برخوردار بن سید احمد بن سید محمد بن سید محمود خنگ سوار بن سید مکارم بن سید عبداللہ بن سید اسمٰعیل بن سید برخوردار بن سید مرتضیٰ بن سید سلطان علی بن حضرت امام علی رضا علیہ السلام بن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن امام جعفر صادق علیہ السلام بن امام محمد باقر علیہ السلام بن امام زین العابدین علیہ السلام بن حضرت امام حسین شہید دشت کربلا بن حضرت علی کرم اللہ وجہ''۔

نانیہالی سلسلہ:

''سید اکرام حسین (پرویز شاہدی) بن عائشہ خاتون بنت لطف النساعرف مدینہ بنت سید شاہ شاہد حسین راجگیری بن امام حضرت شاہ محمد عرف سید شاہ محمدی راجگیری بن سید شاہ وارث علی بن سید میر احمد علی بن میر سید میر علی بن سید حمید الدین بن سید احمد اللہ بن سید عبداللہ بن خواجہ سید القوی بن سلیم القلب خواجہ سید تاج محمود حقانی بن خواجہ سید قطب الدین بن خواجہ سید عبداللہ چشتی ٹھٹہ بھکری بن خواجہ سید اسداللہ چشتی گنج نشیں بھکری بن خواجہ سید برہان الدین بن خواجہ سید عبدالرحمٰن بن خواجہ سید محمد جان بن خواجہ سید محمد سمعان ثانی بن خواجہ سید منصور بن قطب الاقطاب حضرت خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی بن حضرت خواجہ سید ناصر الدین ابویوسف چشتی بن سید محمد سمعان مذکور رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بن سید ابراہیم بن سید محمد بن سید حسین بن عبداللہ المقلب بعلی اکبر بن سید ابوعبداللہ (کنیت حضرت جعفر ثانی) بن سید امام علی نقی بن سید امام محمد تقی بن امام سید علی رضا بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام محمد باقر بن سید امام علی زین العابدین بن حضرت امام حسین شہید دشت کربلا بن حضرت علی کرم اللہ وجہ''۔

خاندان:

پرویز شاہدی کے جد اعلیٰ میں سید محمود خنگ سوار سلطان محمد غوری کے عہد حکومت میں واردِ ہند ہوئے۔ غوری نے انہیں اپنی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ یہ زمانہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر کا ہے۔ سید محمود خنگ سوار صوفی بزرگ اور صاحب کشف تھے، ان کا مزار اجمیر شریف میں ہے۔ ان کی نسلیں تقریباً پانچ سو برسوں تک دہلی اور اس کے اطراف میں آباد رہیں، پھر ان میں سے ایک بزرگ نے دہلی کو الوداع کہا اور ضلع پٹنہ کے موضع سکریچہ (پن پن ندی کے کنارے ایک گاؤں) میں بودوباش اختیار کر لی۔ مغلیہ عہد حکومت میں یہاں انہیں خاطر خواہ زمینیں حاصل ہوئیں۔ یہ خاندان تیزی سے ترقی کرتا گیا اور اس کا شمار بہار کے رئیس اور زمیندار گھرانوں میں ہونے لگا۔

پرویز شاہدی کا خاندان ابتدا سے ہی زمینداری کے ساتھ تصوف اور درویشی کے دامن سے بھی وابستہ رہا۔ ان کے پردادا کے والد سید واجد حسین اپنے عہد کے ممتاز صوفی بزرگ تھے۔ ان

کا خاندان صدیوں سے سکریچہ میں آباد تھا اور یہاں ان کی زمینداریاں بھی تھیں۔ میر واجد حسین اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب ڈپٹی کلکٹر کے منصب تک پہنچے۔ عزت وشہرت بھی حاصل کی اور سکریچہ کے اطراف میں زمینیں بھی خریدیں اور مکانات تعمیر کرائے۔ تھوڑی زمینیں پٹنہ میں بھی حاصل کیں؛ مگر زندگی کا بیشتر حصہ سکریچہ میں گزارا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

میر واجد حسین کے صاحبزادے سید شاہد حسین پرویز شاہدی کے پردادا تھے۔ (حسن اتفاق کہ پرویز شاہدی کے پرنانا کا نام بھی شاہد حسین ہی تھا، پرویز شاہدی نے اس دوطرفہ خاندانی رابطے کے اظہار کے لیے اپنے نام کے ساتھ 'شاہدی' کا اضافہ کیا) سید شاہد حسین کی شادی میر احمد علی (راج گیری) کی دختر بی بی بخشن سے ہوئی، جن سے پرویز کے دادا سید حامد حسین اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ ان میں پہلی کی شادی میر عمر دراز، رئیس محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی سے ہوئی (یہ لاولد رہیں)۔ دوسری کی شادی میر ابو محمد ولد منشی امیر علی مرحوم موضع کٹرہ، ضلع گیا سے انجام پائی اور تیسری کی شادی سید شاہ شاہد حسین ولد سید شاہ لطافت حسین، رئیس وزمیندار خسروپور، پٹنہ سے ہوئی۔

پرویز شاہدی کے دادا سید حامد حسین بھی اپنے عہد کے صوفی بزرگوں میں تھے۔ انہوں نے ایک طرف بزرگوں سے ورثے میں ملی ہوئی زمیندارانہ شان کو عمر بھر گلے لگائے رکھا تو دوسری طرف تصوف سے غایت دلچسپی اور انہماک کے سبب وعظ وپند کی محفلیں بھی سجاتے رہے۔ مستقل طور پر لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی میں ہی قیام پذیر رہے اور جب تک صحت رہی ہر سال ایک دو ماہ کے لیے سکریچہ جاتے رہے۔ عمر کے آخری دہے میں پٹنہ سٹی کے ہی ہو کر رہ گئے۔

سید حامد حسین کی شادی نواب سید شمس الہدیٰ (سی آئی ای) رئیس لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی کی دوسری اہلیہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی متولد ہوئیں۔ صاحبزادوں میں سید احمد حسین (پرویز شاہدی کے والد بزرگوار) سید عالم حسین اور سید عطا حسین تھے اور صاحبزادی حاجی سید عبدالرزاق ولد حاجی سید میر احمد حسین رئیس، صدر گلی، پٹنہ سٹی سے منسوب تھیں۔

سید حامد حسین کے فرزند اکبر سید احمد حسین المتخلص 'ضوؔ' کی شادی سیدہ صغریٰ خاتون بنت سید عبدالغفور (راج گیر) سے انجام پائی؛ لیکن صغریٰ خاتون کے ناگہانی انتقال کے سبب ان کا عقدِ ثانی صغریٰ خاتون کی چھوٹی بہن سیدہ عائشہ خاتون سے ہوا، جن سے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں

ہوئیں۔ ان میں سب سے بڑے سید اکرام حسین (پرویز شاہدی) تھے۔ ان کے بعد دو صاحبزادیاں سیدہ سلمیٰ راز عرف رئیسہ خاتون (زوجہ سید مجیب الرحمٰن ایڈوکیٹ ولد عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ، گلاب باغ، پٹنہ) اور سیدہ ام سارہ مخفی (زوجہ سید شاہ جعفر حسین ولد خان بہادر نواب شاہ واجد حسین، رئیس خسروپور) تھیں۔ چوتھے سید انعام حسین تھے (تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں حبیب بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے) ان کے بعد سیدہ کبریٰ پنہاں عرف کبن (زوجہ سید اظہار احمد ولد سید انوار احمد، ریٹائرڈ کمشنر انکم ٹیکس، بہار شریف، متمکن کدم کنواں، پٹنہ) اور سیدہ ام رسول سوز رشیدہ خاتون عرف رسن (زوجہ سید قیام الدین ایڈوکیٹ، بہار شریف) تھیں۔ سب سے آخر میں سیدہ عالیہ خاتون زریں عرف علن (زوجہ محمد یوسف برکات ولد مجیب البرکات، ملکی محلّہ، آرہ) تھیں۔

پرویز شاہدی کے والد احمد حسین ضو کے بڑے ماموں سید نور الہدیٰ غالباً بہار کے پہلے مسلمان ہیں، جو سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر کیمبرج یونیورسٹی، انگلینڈ گئے اور وہاں سے بیرسٹر ہو کر وطن لوٹے، ایک عرصہ تک ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے عہدے پر متمکن رہے۔ انہوں نے اپنے والد نواب سید شمس الہدیٰ کے نام پر دینی علوم کی خاطر اپنے ذاتی صرفے سے مدرسہ شمس الہدیٰ قائم کیا۔ اس سے متصل ایک شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی، جو ''نوری مسجد'' کے نام سے مشہور ہے۔

پرویز شاہدی کے بڑے ماموں حافظ سید مظفر الدین احمد ایک خوش فکر اور خوش گلو شاعر تھے، ہر چند کہ پیدائشی نابینا تھے، مگر تخلص بینا تھا۔ ان کا سارا سرمایہ کلام دست برد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ ایک غزل کے تین اشعار جو دستیاب ہو سکے ہیں، اس طرح ہیں:

یاس کا، حسرت کا، ارماں کا ہے دل میں اک ہجوم
ارتعاش غم ہے لیکن ساز دل خاموش ہے
یہ وفور ذوق غم اب آہ کیوں اور کس لیے
اضطراب دل ٹھہر تو ہے کہاں کچھ ہوش ہے
نغمہ ہائے تار دل سے چونکتا ہوں خواب میں
ایک صورت سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے

ان کا ایک نہایت خوبصورت شعر مزید ملاحظہ کیجیے:

تڑپ تڑپ نہ دل بے قرار پہلو میں
ٹھہر ٹھہر کہ ہے تصویر یار پہلو میں

پرویز شاہدی کے چھوٹے ماموں سید عبدالصمد، بی این کالج، پٹنہ میں فارسی کے استاد تھے۔ ان کا شعری وادبی ذوق بھی نہایت ستھرا تھا۔ اپنے قلمی نام صبارشیدی سے مشہور تھے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ غزل گوئی سے زیادہ ان کا میلان نظم نگاری کی طرف تھا۔ انہیں صحافت سے بھی غایت دلچسپی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے ذاتی صرفے سے راج گیر سے ایک خالص ادبی ماہنامہ ''فطرت'' جاری کیا تھا، جو برسوں جاری رہا۔ ان کی بیشتر نظمیں اورغزلیں اپنے ہی رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔ ماہنامہ ''فطرت'' کے بعض شمارے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں اب بھی موجود ہیں۔ بقول رضامظہری:

''....بڑا ستھرا ادبی ذوق تھا ان کا، ان کی جواں مرگی نے بہار سے ایک ہونہار ادیب اور شاعر چھین لیا''۔

(ماہنامہ'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص۳۳)

صبارشیدی کی غزل کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں:

موجۂ بادۂ الست عشق کے ہر خمار میں
جلوۂ طور کی تڑپ حسن کے ہر نکھار میں
ذرۂ سوز و ساز ہے درس حیات کشمکش
دیکھ نشان کارواں اڑتے ہوئے غبار میں
حسن حقیقت آشنا محرم دیدہ ہے مگر
شوق حجاب پھر وہی جلوۂ باربار میں

پرویز شاہدی کے والد بزرگوار عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں استادانہ مہارت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں انگلینڈ تشریف لے گئے اور وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۱۳ء میں وطن واپس ہوئے۔ بقول رضامظہری:

''پرویز بھائی کے والد سید احمد حسین صاحب رئیس لودی کٹرہ بیرسٹر تھے، مگر پریکٹس کبھی نہ کی۔ ولایت سے کوئی ولایتی بیوی لے کر آتا ہے، وہ صوفی بن کر آئے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا تو خالص مولویوں جیسی قطع لمبی داڑھی، نورانی چہرہ۔ پرویز بھائی بیان کرتے تھے کہ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے ہیں، ادب سے لگاؤ ہے، مگر صوفی منشی سب پر حاوی

ہے۔ اسی صوفی منشی سے لاکھوں کی جائیداد خاک میں ملادی۔ کارندوں نے خوب خوب ہاتھ رنگے۔ پرویز بھائی نے ایک بار کہا تھا کہ خاندان کی مالی تباہی ان کے دادا مرحوم کے وقت ہی سے شروع ہو چکی تھی، خاتمہ والد کے عہد میں ہوا''۔

(ماہنامہ'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص۳۳)

پیدائش:

پرویز شاہدی کی پیدائش ۲۱؍ستمبر ۱۹۱۰ء (۶؍رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ، چہارشنبہ) کو اپنے دادا سید حامد حسین کے مکان عالم منزل، رانی پور، لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ پیدائش کے زمانے میں والد گرامی حصول علم کی غرض سے لندن میں مقیم تھے۔ ان کی واپسی (۱۹۱۳ء) تک پرویز شاہدی کی عمر دو سال سے تجاوز ہو چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں جب ان کا داخلہ ایم ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن، کلکتہ میں ہوا تو قانونی بندشوں کے پیش نظر ان کی پیدائش ۲؍اگست ۱۹۰۸ء درج کرادی گئی؛ کیوں کہ اس زمانے میں میٹرک کے امتحان میں شرکت کے لیے عمر کی قید سولہ سال تھی، چنانچہ میٹرک کی سند میں یہی درج ہے؛ مگر پرویز شاہدی کا اصل سال پیدائش ۱۹۱۰ء ہی ہے۔ سبھوں کا اسی پر اتفاق ہے۔ خود پرویز شاہدی نے اپنی زندگی کی آخری نثری تحریر ''متاع فقیر''، مشمولہ ''تثلیث حیات'' میں اپنا سال پیدائش ۱۹۱۰ء لکھا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہوا احمد حسین اردو میں شعر گوئی کا صاف اور ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ 'احمد' اور 'ضو' دونوں تخلص استعمال کرتے تھے اور صفیر بلگرامی کے شاگرد عین الہدیٰ ثمر آروی کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے۔ اس وقت عظیم آباد کے شعری افق پر متعدد ستارے روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ شاد عظیم آبادی، بیتاب عظیم آبادی، ثاقب عظیم آبادی، مبارک عظیم آبادی، ثمر آروی، زار عظیم آبادی، فضل حق آزاد، مسلم عظیم آبادی، بسمل عظیم آبادی اور دوسرے اہم شعرا یہاں کی ادبی وشعری محفلوں کو رونق بخش رہے تھے۔ اکثر و بیشتر احمد حسین ضو کے دولت کدے پر شعری محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ پرویز شاہدی بچپن سے ہی ان محفلوں میں سامعین کی صف میں شریک رہتے تھے۔

تعلیم اور اساتذہ:

پرویز شاہدی کی ابتدائی تعلیم زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ ان کے پہلے باضابطہ

استادمولوی منورعلی تھے،جنھوں نے انہیں دس سال کی عمر تک درس نظامیہ کے مطابق عربی وفارسی اوردیگرعلوم کادرس دیا۔انگریزی کاابتدائی درس والد ماجد کی نگرانی میں حاصل کیا،پھرایک خاتون انگریزی پڑھانے کے لیےمقرر کی گئیں؛لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔اس کے بعد تقریباًبارہ سال کی عمر میں ماسٹرشرف الدین انہیں انگریزی پڑھانے کے لیےمقررکئے گئے۔شرف الدین صاحب اوروالد کے مشورے سے پرویزشاہدی۱۹۲۴ء میں شرف الدین صاحب کے ہمراہ کلکتہ روانہ ہوئے اورایک سال ایم ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن میں داخلہ لےکرامتحان کی تیاری کی اور ۱۹۲۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا،پھرعظیم آبادواپس ہوگئے اور ۱۹۲۷ء میں نیوکالج (موجودہ پٹنہ کالج) سےآئی اے کیا۔بی اے کی تیاریوں میں مشغول تھے کہ سخت قسم کی سردی کا شکارہوگئے۔ڈاکٹروں کے مشورے پر تبدیلی آب وہوا کی خاطراپنے پھوپھی زاد بھائیوں سیدشاہ جعفرحسین،سیدشاہ اصغرحسین اورسیدشاہ باقرحسین کے ہمراہ اپریل ۱۹۲۹ء میں مسوری چلے گئے اورچار پانچ ماہ کے بعدوطن واپس ہوئے۔۱۹۳۰ء میں پٹنہ کالج سے فارسی آنرز میں بی-اے کیا۔ان کے والداورگھر کے دیگر بزرگوں کا خیال تھا کہ پرویزشاہدی قانون کی سندحاصل کریں اوراس شعبے میں اعلی مقام تک جائیں،اس خیال کے تحت ان کا داخلہ ایل ایل بی میں کرادیا گیا؛لیکن پرویزشاہدی کا ذہن قانون کی تعلیم حاصل کرنے پرآمادہ نہیں تھا،چنانچہ آخرکار یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم-اے اور۱۹۳۵ء میں فارسی میں ایم-اے کیا،پھرایک جذباتی سانحے کےسبب پٹنہ کوخیرباد کہتے ہوئے کلکتہ چلےآئے۔

شاعری کاآغاز:

جیسا کہ ذکرہواپرویزشاہدی کے والداحمد حسین ضوبھی شاعر تھے اوران کے دولت کدے پرشعری محفلیں برپاہوتی رہتی تھیں۔پرویزشاہدی عہدطفلی سے ہی ان محفلوں میں سامعین کی صف میں شریک رہتے تھے،چنانچہ بچپن سے ہی طبیعت میں موزونیت آگئی اورپھرخدادادصلاحیت توتھی ہی؛اس لیے عمر کی آٹھویں نویں منزل آتے آتے شعرگوئی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ابتدامیں ''اکرام'' تخلص اختیارکیا،اس تخلص کے ساتھ کہی گئی ایک ابتدائی غزل کے دوتین شعربطورحوالہ ادھرادھرنقل ہوتے رہے ہیں:

تم کو یہ گماں ہے کہ محبت نہیں مجھ کو
اللہ کو معلوم ہے جو حال مرا ہے
جو گفتگو بن کے ترے لب سے ہے نکلتی
وہ اس دل بیتاب کے رونے کی صدا ہے
اکرام میں ہوں اس دل مجبور سے عاجز
رونے کی نہ طاقت نہ خموشی میں مزا ہے

مگر جلد ہی جوہرنظامی کے مشورے بلکہ اصرار پرتخلص ''پرویز'' اختیارکیا،اورپردادااور پرنانا دونوں کا نام سیدشاہدحسین ہونے کے سبب پرویز کے ساتھ ''شاہدی'' کااضافہ کیا۔کم عمری سے ہی شعرگوئی کی طرف رجحان کے سلسلے میں خودان کااپنابیان ہے:

> ''جہاں تک میری شاعری کاتعلق ہے،چونکہ میرے والد بزرگوار بھی شعر کہتے تھے اورہمارے مکان میں اکثرشعرخوانی کی محفلیں گرم ہواکرتیں۔میں آٹھ یانو سال کی عمر سے ان محفلوں سے دلچسپی لینے لگا تھا۔پہلے صرف ایک کم عمراورنافہم سامع کی حیثیت سے شریک ہوتارہا،بعدمیں خودشعرکہنے کی جرأت ہوئی۔طبیعت اثرصحبت سے موزوں ہوچلی تھی،تک بندی کرنے لگا۔کبھی کبھی کتربیونت اورکاٹ چھانٹ سے کام لے کر اندوختہ دیگراں کوبھی اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کرتا۔دادتحسین سے ہمت بڑھنے لگی۔میں نے حضرت مولانا عین الہدی صاحب ثمر جانشین حضرت صفیر بلگرامی سے رجوع کیااوران کوغزلیں دکھانے لگا۔ان غزلوں کی حیثیت عطیہ استاد سے زیادہ نہیں تھی''۔

(’تثلیث حیات‘،پرویزشاہدی،اسرارکریمی پریس،الہ آباد،۱۹۶۸ء،ص۱۴)

پہلاشعر:

پرویزشاہدی کے پہلے شعر کے حوالے سے تقریباًتمام ناقدین نے لکھاہے کہ ان کے یہاں ایک ملازم تھا،جوپرویزشاہدی کے اکثراخراجات کوان کی فضول خرچیوں میں شمار کرتا تھا۔یہ ملازم بڑا وفادارتھا۔پرویزشاہدی اس کی معصومانہ حرکتوں سے کبھی پریشان بھی ہوتے تھےاورکبھی لطف اندوزبھی۔مظہرامام نے ملازم کا نام نظیر(ماہنامہ’زبان وادب‘،پٹنہ،پرویزشاہدی نمبر،فروری مارچ ۱۹۸۰ء،ص۸۴)اورعلیم اللہ حالی نے شرف الدین(’پرویزشاہدی‘(مونوگراف)علیم اللہ حالی،ساہتیہ اکادمی دہلی،۲۰۰۰ء،ص۱۵)بتایاہے۔ممکن

ہے دونوں الگ الگ وقتوں کے ملازم ہوں، یا شرف الدین ہی کی عرفیت نظیر بھی ہو۔ پرویز شاہدی نے اسی کی حرکتوں کے پیشِ نظر درج ذیل شعر کہا تھا، جو اتفاق سے ان کا پہلا شعر قرار پایا:

ایسا نوکر جہاں میں کم نکلے
خرچ ہو میرا ، اس کا دم نکلے

پہلا باضابطہ مشاعرہ:

۱۹۲۳ء میں محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا، جس کا قافیہ آنے، جانے، پانے وغیرہ اور ردیف ''کے لیے'' تھی۔ اس مشاعرے میں پرویز شاہدی نے پہلی بار بحیثیت شاعر شرکت کی، اور ایک طویل غزل پیش کر کے اپنے باضابطہ شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ اس مشاعرے میں ان کی غزل کا مطلع بہت پسند کیا گیا:

ہاتھ خالی قبر پر وہ کیوں ہیں آنے کے لیے
کم سے کم دو پھول تو لاتے چڑھانے کے لیے

دو برس بعد ۱۹۲۵ء میں جب پرویز شاہدی، نیو کالج، پٹنہ (موجودہ پٹنہ کالج) کے طالب علم تھے، کالج میں بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ شاد عظیم آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر بھی پرویز شاہدی کی غزل پسند کی گئی، خصوصاً مطلع پر شاد عظیم آبادی نے کھل کر داد دی:

نہ پوچھو رو رہا ہوں کیوں نوائے مرغِ نسیاں پر
پریشاں جانتا ہے کیا گزرتی ہے پریشاں پر

تلمذ:

جیسا کہ ذکر ہوا، پرویز شاہدی کے والد احمد حسین ضو شعر گوئی کا صاف اور ستھرا مذاق رکھتے تھے اور شاعری میں ثمر آروی کے شاگرد تھے۔ ان کے دولت کدے پر اکثر و بیشتر شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں اور پرویز شاہدی ان محفلوں میں بحیثیت سامع شریک رہتے تھے۔ جب انہوں نے آٹھ نو سال کی عمر میں شاعری شروع کی تو انہوں نے بھی ثمر آروی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس باب میں خود ان کا بیان دیکھئے:

''میں نے حضرت مولانا عین الہدیٰ صاحب ثمر جانشین حضرت صفیر بلگرامی

سے رجوع کیا اور ان کو غزلیں دکھانے لگا۔ ان غزلوں کی حیثیت عطیہ استاد سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اشعار جن کو میں اپنا سمجھ سکتا تعداد میں بہت کم ہوتے۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا۔ میں نے دو چار غزلوں کے بعد ہی اصلاح لینا ختم کر دیا''۔

('تثلیث حیات'، پرویز شاہدی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴)

تلامذہ:

پرویز شاہدی نے ہر چند کہ اپنی ابتدائی چند غزلوں پر ثمر آروی سے اصلاح لی تھی، مگر ان کے نزدیک ان غزلوں کی حیثیت ''عطیہ استاد'' سے زیادہ نہیں تھی، چنانچہ وہ اسی زمانے سے شاعری میں استادی اور شاگردی کے رشتے سے باز آ گئے، البتہ کسی نوجوان شاعر کے اندر مستقبل کے امکانات دیکھتے تو اسے مشورہ دینے کے قائل ضرور تھے۔ پروفیسر مختار الدین احمد بھی ایک زمانے میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور تخلص ''آرزو'' رکھا تھا، جب انہوں نے پرویز شاہدی سے اپنے کلام پر اصلاح چاہی تو پرویز شاہدی نے ان سے کہا:

''میں شاعری میں استادی شاگردی کا قائل نہیں۔ بھروسہ آپ کو اپنی طبیعت اور اپنے شعری ذوق پر رکھنا ہوگا؛ تاکہ کلام کے حسن و قبح کا آپ کو پورا اندازہ ہو سکے۔ ہاں، مشورہ ضرور دیا کروں گا''۔

('ذکر مختار'، مالک رام، مشمولہ: 'نذر مختار'، مرتبہ: مالک رام، ۱۹۸۸ء، ص ۳۱)

بیعت:

پرویز شاہدی اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، جہاں علم و ادب، مذہبی ترفع اور صوفیانہ مزاج و میلان آپس میں شیر و شکر تھے۔ ان کا خاندان جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، ابتدا سے ہی زمینداری کے ساتھ درویشی کے دامن سے بھی وابستہ رہا۔ ان کے پردادا کے والد سید واجد حسین اپنے عہد کے ممتاز صوفی بزرگ تھے۔ ان کے گھر میں جہاں شعری محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، وہیں وعظ و پند کی محفلیں بھی گرم رہتی تھیں۔ ان کے خاندان کے افراد کسی نہ کسی بزرگ کے حلقہ ارادت سے وابستہ تھے، چنانچہ دس سال کی عمر میں (۱۹۲۰ء) پرویز شاہدی بھی اپنے والد اور خاندان کے چند دوسرے افراد کے ہمراہ دہلی گئے اور مشہور صوفی بزرگ سید شاہ منور علی کے سلسلے کے ایک بزرگ سید شاہ جمیل

الرحمٰن چشتی نظامی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔اس باب میں پرویز شاہدی نے فقط اتنا لکھا ہے:

''اسی زمانہ طفلی میں، میں نے ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔میرے خاندان کے افراد میں سے اکثر انہیں کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکے تھے''۔

('متاع فقیر' مشمولہ 'تثلیث حیات'، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱)

مذہبی ماحول اور پھر بیعت کا اثر یہ ہوا کہ پرویز شاہدی نماز پنجگانہ کے ساتھ اوراد اور وظائف کے پابند ہوگئے۔یہ سلسلہ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا، پھر اس میں بتدریج کمی آتی گئی اور ۱۹۳۵ء میں کلکتہ پہنچنے کے بعد یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا۔

عادات وخصائل:

پرویز شاہدی مخلص انسان اور انسان دوست، حسن پرست اور مغلوب الجذبات تھے۔آنکھوں سے ذہانت اور چہرے بشرے سے معصومیت ہویدا تھی۔عیب جوئی، غیبت، رشک وحسد اور غرور کا مادہ بالکل نہ تھا۔کینہ پروری اور منافقت سے ذرّہ برابر واسطہ نہیں تھا۔کشادہ دلی اور اعلی ظرفی کا ہردم مظاہرہ کرتے تھے۔ذخیرہ اندوزی کے قائل نہ تھے۔فیاضی، دریادلی اور عاجزی وانکساری مزاج کا خاصہ تھا۔حسن پرست تھے؛ مگر دولت وشہرت پرست نہ تھے۔خوش خوراک اور بلا کے سگریٹ نوش تھے۔بقول سعید احمد اکبرآبادی:

''....پرویز جتنے بڑے شاعر اور فنکار تھے اخلاق اور عادات واطوار کے اعتبار سے بھی اتنے ہی قابل قدر اور محبت کے لائق تھے۔نہایت ذہین اور طباع تھے؛ لیکن چہرے پر عجیب طرح کی معصومیت برستی تھی۔غیبت، رشک وحسد، عیب جوئی اور ایذارسانی ان چیزوں کا ان کے پاس دور تک بھی گزر نہیں تھا۔بے حد سیر چشم اور فیاض تھے۔روپیہ پیسہ کی محبت، یا جاہ ومنصب کی جستجو سے انہیں کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔واقعہ یہ ہے کہ دل کا صاف اور ستھرا ایسا انسان ہمارے سماج میں کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۹)

وضع قطع:

مورخین نے لکھا ہے کہ پرویز شاہدی کا قد درمیانہ، رنگ گندمی مائل تھا۔آنکھیں بڑی بڑی اور

روشن تھیں، جن میں سرخ ڈورے پڑے رہتے تھے۔مزاج قلندرانہ اور انداز معصومانہ تھا۔طبیعت میں سیمابیت تھی، لہٰذا کسی منزل قرار نہیں تھا۔ان کی قلمی تصویر رضا مظہری نے ان الفاظ میں اتاری ہے:

''گندمی رنگ، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، لمبے اور بکھرے ہوئے بال جنہیں بار بار وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے سنوارتے جاتے تھے۔بر میں شیروانی اور ٹانگوں میں سفید پائجامہ۔پہلی ہی نظر میں پتہ چلا کہ یہ حضرت کوئی عظیم آبادی ہیں اور غالباً شاعر ٹائپ کے ہیں''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۲۶)

کھیل کود:

پرویز شاہدی کھیل کود سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے؛ بلکہ عملی طور پر مختلف کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔جوہر نظامی نے لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے ہی پتنگ بازی، کیرم، برج اور فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا۔منگل تالاب، پٹنہ سٹی کے میدان میں روزانہ فٹ بال کھیلتے تھے۔ان کے ہمراہ فٹ بال، ہاکی، شطرنج، ٹینس، کیرم اور کبڈی کھیلنے والوں میں حمید عظیم آبادی، محمود علی خاں صبا، منورالہدیٰ، جبار، ابوالحیات، مشہور سرجن ڈاکٹر نواب کے چھوٹے بھائی حسن نواب، یوسف صاحب رئیس کے صاحبزادے علی صاحب، عبدالخالق صاحب اور جوہر نظامی شریک ہوتے تھے۔

کھیل کود کے ساتھ پرویز شاہدی کو اداکاری سے بھی شغف تھا۔فلموں کا رواج کم ہونے کے سبب لوگوں کی تفریح کا ایک اہم ذریعہ ڈرامہ تھا اور ان دنوں آغا حشر کے ڈراموں کا ہر طرف بول بالا تھا۔یہ ڈرامے نہایت آن بان سے اسٹیج کئے جاتے، چنانچہ اسکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں بھی ڈرامے خصوصاً آغا حشر کے ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے۔پرویز شاہدی ان ڈراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اپنی کامیاب اداکاری کے سبب مرکز نگاہ ہوجاتے۔اس سلسلے کا ایک واقعہ رضا مظہری کی زبان سے سنئے:

''کتاب زندگی کے پچھلے سینتیس ورق الٹتا ہوں تو مجھے ۱۹۳۷ء کی گرمیوں کے موسم کی ایک رات یاد آتی ہے۔میں مظفرپور سے پٹنہ آیا ہوا تھا۔امتحانات ختم ہو چکے تھے۔بے فکری کا زمانہ دوستوں میں گذارنے کے لیے پٹنہ ہی یاد آتا تھا۔انہیں دوستوں

کی ایک بیٹھک میں یہ ذکر چھڑا کہ آج رات کو سنہا لائبریری ہال میں پٹنہ کالج کے طلبا آغا حشر کا ایک ڈرامہ پیش کر رہے ہیں۔ عباس (جو آج کل D.I.G.Pollice سنٹرل رینج ہیں) اس چنڈال چوکڑی کے سرگروہ تھے۔ مجھے بھی ساتھ پکڑ لے گئے۔ ڈرامہ بہت کامیاب رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ آغا صاحب کا کون سا ڈرامہ تھا، مگر اس میں ایک اہم کردار ادا کرنے والا ایک نوجوان اپنی والہانہ اداکاری کی وجہ سے سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد میں نے جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نوجوان سید اکرام حسین، پٹنہ کالج میں بی۔اے کے آخری سال کے طالب علم ہیں اور پٹنہ سٹی کے محلّہ لودی کٹرہ کے ایک قدیم خاندان روسا کے چشم و چراغ ہیں''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۲۶)

ترکِ وطن:

پرویز شاہدی کے ترکِ وطن کے سلسلے میں متضاد رائیں ملتی ہیں۔ اس باب میں جوہر نظامی فرماتے ہیں:

''پرویز شاہدی کی جوانی کے شب و روز ایک امیرانہ اور رئیسانہ ماحول میں گزرے ہیں اور جب گھر کی اقتصادی زندگی کا نقشہ بدلا ہوا دیکھا تو ایک زمرد کی انگوٹھی کچھ ارزاں فروخت کر کے گھر کے آباد ویرانے کو خیر باد کر کے پٹنہ سٹی سے کلکتہ جا براجے''۔

(ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۱)

جوہر صاحب اپنی ایک دوسری تحریر میں بیان فرماتے ہیں:

''گھر کے شاہانہ اخراجات کی وجہ سے جب کچھ آثار بدحالی کے ظاہر ہونے لگے تو میری تحریک پر وطن کو خیر باد کہنے پر تیار ہو گئے اور جب پہلی مرتبہ ترکِ وطن کے خیال سے کلکتہ کے لیے سامان سفر باندھا تو ماں اور بہنوں کا اور چھوٹے بھائی انعام کا جو حال تھا، وہ بیان سے باہر ہے۔ راقم الحروف تمام دن ان کے سامان کو تیار کرنے میں معاون و مددگار رہا اور شب کی ٹرین سے وہ کلکتہ چلے گئے''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۰)

جوہر نظامی ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''شروع شروع میں ان کی بہت نسبتیں آئیں؛ مگر والدین کی طرف سے نامنظور ہوتی رہیں۔ خاندان کی ایک لڑکی سے رشتہ چاہتے تھے۔ لڑکی کی بھی دھیمی دھیمی یہی خواہش تھی؛ مگر کامیاب نہیں ہوئے؛ لیکن جس لڑکے سے محض دولت پر رشتہ ہوا، وہ بعد کو زیادہ روح فرسا ثابت ہوا (میں نے عمداً نام ظاہر نہیں کیا) اس رشتے کی ناکامی کا احساس پرویز کو بھی رہا''۔

(ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۲)

جوہر نظامی نے جس واقعے کا اجمالاً ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ انہیں اپنی پھوپھی زاد بہن سے عشق ہو گیا تھا؛ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی تھی۔ شادی کی بات بھی تقریباً طے تھی۔ اس وقت پرویز کے خاندان کا شمار پٹنہ کے زمیندار گھرانوں میں ہوتا تھا؛ مگر تیزی سے ختم ہوتی ہوئی ریاست کے سبب لڑکی والوں نے ادھر سے نظریں پھیر لیں اور لڑکی کا رشتہ دوسرے دولت مند گھرانے کے لڑکے سے طے کر دیا۔ پرویز شاہدی سے رشتہ ترک کرنے کا سبب ان کی بے روزگاری اور لااُبالی پن کو بنایا۔ اس حادثے سے پرویز حد درجہ دل برداشتہ ہوئے اور لڑکی کی شادی کے دو تین دن قبل ہی پٹنہ کو خیر باد کہہ کر کلکتہ آ گئے۔ ان کا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

مانا کہ ہے سونے سے لکھے جانے کے قابل
پرویز کے اشعار کوئی زر تو نہیں ہیں

پرویز شاہدی کے ترکِ وطن کے سلسلے میں ناصر زیدی لکھتے ہیں:

''ادیب ہو، یا شاعر جب تک لذت آشنائے غم نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی تخلیقات کا رنگ نہیں ابھرتا۔ پرویز بھی ایک ایسے ہی حادثہ کے شکار ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵-۳۶ سال رہی ہوگی۔ اس صدمہ سے دوچار ہوئے تو تاب نہ لا کر پٹنہ کو خیر باد کہا اور کلکتہ جا بسے''۔

(ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۸)

مگر ترکِ وطن کی کہانی علی عباس بیخود سب سے الگ بیان کرتے جو سراسر قیاس پر مبنی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۳۶ء کے شروع میں مولانا وحشت اسلامیہ کالج کی معلّمی سے سبکدوش

ہوگئے۔ان کی جگہ کا اخباروں میں اعلان ہوا،اس اعلان کو دیکھ کر پرویز شاہدی کلکتہ
آتے ہیں''۔

(ماہنامہ 'مریخ'،پٹنہ،پرویز شاہدی نمبر،اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء،ص۵۲)

ملازمت:

پرویز شاہدی نے ۱۹۳۵ء میں ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوکر پٹنہ کو خیرباد کہا اور کلکتہ کارخ کیا،یہاں آکر درس وتدریس کو ہی روزی کا وسیلہ بنایا۔مختلف اسکولوں میں بحیثیت استاد اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔سب سے پہلے مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا،یہ ملازمت عارضی تھی۔محض ایک ڈیڑھ ماہ تک اس ادارے سے وابستہ رہے ہوں گے کہ ۱۹۳۶ء کے شروع میں وحشت کلکتوی،اسلامیہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور اس جگہ کے لیے اوروں کے ساتھ پرویز شاہدی نے بھی درخواست گزاری اور اپنی غیرمعمولی صلاحیت وشہرت کی بنا پر منتخب کرلیے گئے۔اس اسکول میں پرویز شاہدی کی مدت کار مارچ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء کے وسط تک ہے۔اسی درمیان اسکول کی ملازمت کے تقاضوں کے پیش نظر بی۔ٹی کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے اور بقول علی عباس بیجنود،منظور مرشد مرحوم کی وساطت سے سب انسپکٹر آف اسکولس ہوگئے،مگر یہ کام پرویز شاہدی کے مزاج کے منافی تھا،چنانچہ محض چار ماہ کی مدت میں ہی اس سے تنگ آگئے اور اسلامیہ اسکول لوٹ آئے۔خود فرماتے ہیں:

''اسی زمانے میں اسکول کی انسپکٹری ملی لیکن اس جگہ پر مہینوں کام کرتے رہنے کے باوجود میں نے اس کو اپنے مزاج سے برسرپیکار ہی پایا۔اس سے سبکدوشی حاصل کرکے پھر اپنی پرانی جگہ پر واپس آگیا''۔

(''تثلیث حیات''،پرویز شاہدی،اسرار کریمی پریس،الہ آباد،۱۹۶۸ء،ص۱۱)

۱۹۴۱ء میں مدناپور کالج،مغربی بنگال میں اردو وفارسی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔پرویز صاحب اس عہدے کے لیے امیدوار ہوئے اور اپنی غیرمعمولی شہرت اور تدریسی تجربے کی بنیاد پر مدناپور کالج میں مستقل طور پر استاد مقرر ہوگئے۔۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدناپور کالج میں بحیثیت لکچرار اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔۱۹۴۷ء میں سریندر ناتھ کالج،کلکتہ میں لکچرر ہوکر آگئے اور باضابطہ طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔۱۹۴۹ء میں چند کمیونسٹ دوستوں کے ساتھ کلکتہ میں ''انجمن ترقی

پسند مصنفین''میں شامل ہوگئے۔ظاہر ہے اس کے روح رواں پرویز صاحب تھے،ان کی سرگرمیاں سب سے تیز تھیں؛اس لیے حکومت کی نظر میں کھٹکنے لگے اور آخرکار گرفتار کرلیے گئے اور ڈیڑھ سال تک نظربند رہے۔اس ضمن میں خود ان کے جملے دیکھیے:

''......کمیونسٹ تحریک کے سلسلے میں مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ڈیڑھ سال تک نظربند رہا۔باہر آیا تو معلوم ہوا کالج کی نوکری جاچکی ہے۔ایک دم توڑتے ہوئے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی جگہ ملی۔میری زندگی میں اتنا کرب ناک اور مالی لحاظ سے اتنا اذیت بخش دور کبھی نہیں آیا تھا۔دوسال یہاں کی اذیت میں گرفتار رہا،پھر سی ایم او ہائی اسکول کلکتہ میں ہیڈ ماسٹری مل گئی......''۔

(''تثلیث حیات''،پرویز شاہدی،اسرار کریمی پریس،الہ آباد،۱۹۶۸ء،ص۱۲)

بہرحال کمیونسٹ تحریک سے وابستگی کے سبب گرفتار ہونے،جیل جانے،نظربند ہونے،اذیت بخش دور سے گزرنے کے باوجود پرویز شاہدی کے پائے استقلال میں لغزش نہیں ہوئی اور ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلتے رہے:

گیا وہ وقت جب اپنے گریباں چاک کرتے تھے
ستارے ٹانکتے جاتے ہیں اب دامن میں دیوانے
ہر پتے میں اک دھار لیے چٹکیں گے
ہر سانس میں تلوار لیے چٹکیں گے
دہکے ہوئے فولاد کے ہم ہیں غنچے
چٹکیں گے تو جھنکار لیے چٹکیں گے
پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے
خوش ہو رہا ہوں لے کے ہتھیلی پہ سر کو میں
ظالم کی ہر الاپ ہے پیغمبر حیات
بجھنے نہ دوں گا اپنے دل نغمہ گر کو میں
تجھے خاروخس کی سطوت پہ یقین پائیداری
مرے ہر نفس میں رقصاں مرا عزم شعلہ باری

''رجز انقلاب''، ''یانگسی کوسلام''، ''والگا کو سلام''، ''روشنی کو ووٹ دو''، ''بربط دل''، ''تضاد''، ''رقص حیات''، ''ہم جوان ہیں'' وغیرہ نظمیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

پرویز شاہدی نے جس دم توڑتے ہوئے اسکول کا ذکر کیا ہے، وہ انجمن بوائز ہائی اسکول تھا، جہاں ان کی ہیڈ ماسٹری کی مدت ۱۹۵۰ء کے اواخر سے فروری ۱۹۵۳ء تک ہے۔ یہاں وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی اور جو ملتی تھی، وہ بھی قسطوں میں، چنانچہ اس عرصے میں پرویز شاہدی ہمیشہ تنگ دست رہے، پھر چند احباب اور مخلصین کی کوششوں سے فروری ۱۹۵۳ء میں سی ایم او ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔

سی ایم او ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے باب میں سالک لکھنوی کا بیان نہایت اہم ہے۔ وہ بیان فرماتے ہیں:

> ''.... وہ قید و بند سے چھوٹا تو اہل دانش کے لیے ایک ہیرو تھا، ایک مفلس ہیرو۔ اس مفلس ہیرو نے قوم و وطن کی طوطا چشمی کا پردہ رکھنے کے لیے ایک اپنے سے زیادہ مفلس اسکول میں ٹیچری قبول کرلی، جہاں مہینوں تنخواہ ملتی ہی نہ تھی، ملتی بھی کیسے؟ سکریٹری کے اخراجات اسکول ٹیچروں کی ضروریات زندگی سے زیادہ اہم جو تھے۔ اس زمانے میں، میں سی ایم او اسکول کا سکریٹری تھا اور اس اسکول کو کچھ عرصہ قبل ہی ہائی اسکول کا درجہ ملا تھا۔ ایک لائق ہیڈ ماسٹر کی سخت ضرورت تھی۔ میں پرویز کے پاس پہنچا اور بڑی مشکلوں سے انہیں راضی کیا کہ وہ سی ایم او اسکول کی ہیڈ ماسٹری قبول کرلیں۔ سات آٹھ سال تک جس سلیقہ و محنت سے اس نے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض کو نبایا، وہ اسکول کی تاریخ میں ایک زریں باب ہے''۔

(ماہنامہ 'زبان وادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۵)

ابتدا میں سی ایم او اسکول میں پرویز شاہدی کی تنخواہ دو سو پچیس روپے تھی، آگے چل کر دو سو پچاس روپے ہوگئی اور وقت پر ملتی رہی۔ اس طرح ان کی زندگی مالی اعتبار سے آسودہ ہوگئی۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۷ء تک جاری رہا، پھر جنوری ۱۹۵۸ء سے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوگئے، یہ وابستگی تادم مرگ قائم رہی۔

صحافت:

پرویز شاہدی کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ''جدید اردو'' کلکتہ کا مشہور ادبی ماہنامہ تھا، جو ۱۹۳۸ء کے اوائل سے ۱۹۴۹ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ تقریباً دس برسوں تک کلکتہ کی سرزمین

سے اس وقت کوئی دوسرا ایسا رسالہ نہیں تھا، جو مسلسل جاری رہ سکا ہو۔ اس کے مالک جناب عبدالجلیل تھے اور یہ اردو پریس، ۳۶/ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ پرویز شاہدی تقریباً دس برسوں تک اس کے مدیر مسئول رہے۔ ابتدائی زمانے میں اس کے صفحات کی تعداد بتیس (۳۲) تھی؛ لیکن آگے چل کر تعداد میں سولہ (۱۶) صفحات کا اضافہ ہوگیا۔ اس ماہنامہ کے کئی اہم نمبر بھی شائع ہوئے، جن میں ''بنگال نمبر'' اور ''ٹیگور نمبر'' کی اہمیت مسلم ہے۔

پرویز شاہدی نے ''شذرات'' اور ''معروضات'' کے عنوان کے تحت ''جدید اردو'' کے جتنے اداریے تحریر کئے، ان میں علمی و ادبی مسائل کے علاوہ اس وقت کے سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

شادی:

جیسا کہ خود پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء میں ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوئے اور عظیم آباد کو خیرباد کہہ کر کلکتہ آبسے۔ یہاں بھی کئی معاشقوں میں ناکام ہوکر تا عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر ان کے دیرینہ دوست علامہ جمیل مظہری کی مسلسل کوششوں نے بالآخر انہیں اس جانب متوجہ کرلیا اور تقریباً پینتالس سال کی عمر میں ان کی شادی ۶/ نومبر ۱۹۵۵ء کو دن کے گیارہ بجے ایک معزز خاندان کی اعلی تعلیم یافتہ خاتون فضیلت النسا بیگم بنت مجیب الرحمٰن سے پارک سرکس میں ان کی رہائش گاہ لوور رینج میں انجام پائی۔ فضیلت النسا بیگم کا خانوادہ کلکتہ کے فضیلت یافتہ خاندانوں میں تھا۔ ان کے نانا کے نام پر آج بھی کلکتہ کی قدیم شاہراہ علیم الدین اسٹریٹ قائم ہے۔ فضیلت النسا بیگم سخاوت میموریل گرلس اسکول میں استاد تھیں۔ وہ فارسی اور اردو دونوں میں آنرز تھیں اور بی۔ٹی بھی تھیں۔ شادی کے لیے سلسلۂ جنبانی کرنے والوں میں رضا مظہری پیش پیش تھے۔ ان کے علاوہ صغرا سبزواری (مسز پروفیسر طاہر رضوی) جو اسکول میں فضیلت النسا بیگم کی رفیق کار تھیں، ان لوگوں کی کوششوں سے یہ شادی نہایت سادگی سے منتخب معززین شہر کی موجودگی میں انجام پائی۔ شادی سے پہلے ایسی منزل بھی آئی، جہاں پرویز شاہدی کو احساس ہونے لگا کہ شاید یہ رشتہ بھی انجام نہیں پاسکے گا، چنانچہ آزردہ خاطر ہوکر انہوں نے ایک غزل کہی، جو رسالہ ''سہیل'' (گیا) کے نومبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ اس غزل کے یہ چند اشعار اس زمانے میں بہت مشہور ہوئے:

مرے غم کو نہ کیجئے تازہ دم، ہوس خوشی سے نہ کھیلئے
مری زندگی ہے تھکی ہوئی، مری زندگی سے نہ کھیلئے
مرے جلتے رہنے پہ منحصر ہے دلوں کے قافلہ کا سفر
میں چراغ راہ گزر سہی، مری روشنی سے نہ کھیلئے
مرے شوق کو نہ جگائیے، مرے حوصلے نہ بڑھائیے
مرے دل کے پاس نہ آئیے، مری بے دلی سے نہ کھیلئے

اس غزل کے علاوہ پرویز شاہدی نے جذبات سے مغلوب ہو کر مزید چند اشعار اور دو ایک غزلیں کہیں، جن میں درج ذیل غزل میں ان کے دلی جذبات اور اضطراب کا والہانہ اظہار ملتا ہے:

کل کا کچھ اعتبار نہیں ، جلد آیئے
اب تاب انتظار نہیں ، جلد آیئے
کلیاں ہیں فیض سرخی عارض کی منتظر
رنگیں ابھی بہار نہیں ، جلد آیئے
دیجے سزا نہ دل کو مرے اضطراب کی
لیجے میں بے قرار نہیں ، جلد آیئے
شکووں کی گرد اشک کی بارش میں دھل گئی
دل میں مرے غبار نہیں ، جلد آیئے
دھلتا نہیں شراب سے منہ اضطراب کا
میں کوئی بادہ خوار نہیں ، جلد آیئے
تنظیم شوق کے لیے فرصت نکالیے
اب وقت انتشار نہیں ، جلد آیئے
غم آپ کا رفیق غم کائنات ہے
میں قائل فرار نہیں ، جلد آیئے
عجلت میں آرزو ہے ، نہ تاخیر کیجئے
میں یاس کا شکار نہیں ، جلد آیئے

آرائش حیات میں تعجیل چاہئے
بے وجہ انتظار نہیں ، جلد آیئے
اب عذر امتحان تمنا نہ ڈھونڈیئے
کیا مجھ پہ اعتبار نہیں ، جلد آیئے
پرویز کی رفاقت افکار کیجئے
تنہائی سازگار نہیں ، جلد آیئے

بہر حال! ۶ رنومبر ۱۹۵۵ء کو دن کے گیارہ بجے نکاح کے بعد سہرا خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بقول مظہر امام کم از کم پندرہ سولہ شاعروں نے خراج تہنیت پیش کیا۔ ان میں جمیل مظہری، رضا مظہری، علی عباس بیخود، سالک لکھنوی، مظہر امام اور ابراہیم ہوش کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں جمیل مظہری، مظہر امام اور ابراہیم ہوش کی تہنیتی نظموں کے چند نمونے پیش کئے جارہے ہیں:

یہ کس کا جشن عروسی ہے مرحبا پرویز
یہ رن بھی جیت لیا تو نے ہاتھ لا پرویز
بس ایک گھونٹ پیالہ ادھر بڑھا پرویز
جوان تو ہے تو حیرت ہے تجھ کو کیا پرویز
اگر ہمارا بڑھاپا شباب بنتا ہے
یہ وقت وہ ہے کہ پانی شراب بنتا ہے (جمیل مظہری)

زلف گیتی میں ابھی تک ہے شکن یاد رہے
ہے وہی اب بھی زمانے کا چلن یاد رہے
خون روتے ہیں ابھی سرو سمن یاد رہے
ہے ابھی خاک بسر روح وطن یاد رہے
شمعیں محراب محبت میں فروزاں کرنا
ساتھ ہی فکر علاج غم دوراں کرنا (مظہر امام)

حوصلے تیز گامی کے بڑھنے لگے، آج پرویز کو ہم سفر مل گیا
منزلیں کھینچ کے نزدیک آنے لگیں راہ گم کردہ کو راہبر مل گیا (ابراہیم ہوش)

شادی کے بیس روز بعد ۲۷ر نومبر ۱۹۵۵ء کو پرویز کے چند دوستوں اور مداحوں نے کلکتہ کے ہوٹل براڈوے میں ایک پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں تہنیتی نظمیں پیش کی گئیں اور مبارک بادیاں دی گئیں۔ اس موقع پر کاغذی رومال پر شائع مظہر امام کی تہنیتی نظم ''روح شباب''، تقسیم بھی کی گئی۔

اولاد:

شادی کو ابھی ایک برس بھی نہیں ہوا تھا کہ پرویز شاہدی کے گلشن حیات میں ۲۳ر اگست ۱۹۵۶ء کو ایک کلی (سمینہ) کھلی۔ سمینہ کی پیدائش کے سلسلے میں پرویز شاہدی، شریف چکوالی کے نام ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء کے ایک مکتوب میں یوں رقم طراز ہیں:

''میں آج کل بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہوں۔ ۲۲ر اگست کی صبح کو تمہاری بھابی کو اسلامیہ ہسپتال لے گیا اور ۲۳ر اگست کی شام کو آپریشن کیا گیا۔ بچی پیدا ہوئی ہے۔ اس وقت ماں اور بچی دونوں اچھی ہیں، ہسپتال سے واپس آ گئی ہیں، ابھی نقاہت بہت ہے''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۷)

پرویز شاہدی اپنی اکلوتی بیٹی سمینہ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اس کی پیدائش کے خوشگوار لمحے سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک طویل نظم ''تثلیث حیات''، لکھی، جو اسی زمانے میں ماہنامہ ''شاہراہ''، دہلی میں شائع ہوئی۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام بھی اسی نام سے ترتیب پایا۔ یہ نظم مسدس کی ہیئت میں کل اکیس بند پر مشتمل ہے۔ افکار و خیالات اور جذبات و محسوسات کی ایک متحرک تصویر لفظوں کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ اس نہایت خوبصورت نظم سے یہاں ابتدائی تین بند نقل کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں:

انگلیاں میری ہیں لب میرے ہیں آنکھیں میری
میری پیشانی کا ٹکڑا تری پیشانی ہے
ننھی ننھی یہ بھنویں تیری ہیں یا میری ہیں
تیری رگ رگ میں مرے خون کی جولانی ہے
دست و پا میں جو یہ کیفیت سیمابی ہے
میری ہی روح کی نکھری ہوئی بیتابی ہے

اپنے شعروں میں جڑے روح کے ٹکڑے کتنے
اپنے افکار کو خوں دل کا پلا کر پالا

بھر دی ہر لفظ میں شخصیت رنگیں اپنی
اپنے ہی سانچے میں انداز بیاں کو ڈھالا
میرا فن بھی مری تصویر کی تکمیل نہیں
کوئی تجھ سا مرے اجمال کی تفصیل نہیں

تجھ کو اپنے ہی خد و خال تری ماں نے دیئے
اپنا شاداب چمکتا ہوا چہرہ بخشا
خلوت بطن میں ہر طرح سنوارا تجھ کو
پیکر حال کو خون رگ فردا بخشا
تجھ کو بخشی ہے تری ماں نے لطافت اپنی
دیکھتی ہے ترے آئینے میں صورت اپنی

پرویز شاہدی کے انتقال (۵ر مئی ۱۹۶۸ء) کے وقت سمینہ پرویز کی عمر محض گیارہ سال نو ماہ تھی؛ مگر اسی عمر میں پرویز شاہدی نے اپنی اکلوتی صاحبزادی کو ہر طرح تراش کر نگینہ بنا دیا اور جس کی شخصیت میں اختر اورینوی نے پرویز شاہدی کی روشنی اور شیرینی دیکھی اور جس کے لیے دعائیں کی:

''سمینہ پرویز کی شمع کی لَو ہے، اے مالک قوت و حیات! یہ لَو ہمیشہ اونچی رہے، روشن رہے''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۱)

پرویز شاہدی کے انتقال کے بعد اختر اورینوی ستمبر ۱۹۶۸ء میں تعزیت کے لیے اپنی بیگم شکیلہ اختر کے ہمراہ کلکتہ گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

''میں نے بیگم پرویز اور سمینہ کی شخصیتوں میں پرویز کی شخصیت کی روشنی اور شیرینی دیکھی، پرویز صرف انقلاب لانے کے درپے نہ تھے، وہ خوبصورت شخصیتوں کی تعمیر بھی کر سکتے تھے.... پرویز شاہدی نے تربیت لعل بدخشاں کی ہے۔ اس گوہر شب چراغ کی تابانی سے دل و ذہن کو سنجیدہ مسرت حاصل ہوتی ہے اور ایک ایسا غم ملتا ہے، جس پر ہزار مسرتیں قربان ہوں''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۰)

سمینہ پرویز، جواب نزار منان ہیں، اپنے والد سے بے انتہا قریب تھیں اور بقول اختر اورینوی پرویز شاہدی نے جنھیں اپنی تربیت سے لعل بدخشاں بنادیا تھا، انہوں نے اپنے والد کے انتقال پر ملال سے متاثر ہوکر اردو اور انگریزی میں تعزیتی نظمیں قلمبند کی تھیں، جو اختر اورینوی کے حوالے سے یہاں نقل کی جارہی ہیں:

(۱) آتا ہے دن ابا کا خیال لے کر
یاد آتا ہے وہ وقت جب چومتے تھے وہ بے حد پیار سے
لیکن جانا ہے سب کو ایک نہ ایک دن
سب کو چھوڑ کر

(۲) پھولوں کی طرح چہکتی ہوں
تاروں کی طرح چمکتی ہوں
گلشن میں جب بہار آتی ہے
ہر چڑیا گنگناتی ہے
ساگر گیت سناتا ہے
اور میں بہک سی جاتی ہوں

(۳) **Walking past Joy and Sorrow**

As I'm walking past the old street
I stop and look at a house
which brings back memories so sweet
where once we lived,a family united
when everything used to seem lighted
we knew not what is meant by sorrow
As we only thought that joy
would remain till tomorrow
But now when life has to be faced alone
There's no use for moons and groans
Joy does not last for ever
sorrow comes once and forever
Meet life with all your might
and don't ever just sit light.

۲۰۱۵ء میں جب اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار کے سہ ماہی رسالہ ''بھاشا سنگم'' نے ''پرویز شاہدی نمبر'' (جولائی ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۵ء) شائع کیا تو نزار منان نے اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ والد کے انتقال کے وقت وہ اتنی بڑی نہیں تھیں کہ ان کی عظمت اور بزرگی کو سمجھ سکتیں۔ ان کو آج شدت سے یہ احساس ہے کہ آہ! میں نے کیا گنوا دیا۔

معاشقہ:

پرویز شاہدی کے معاشقے کی بھی بعض داستانیں مشہور ہیں۔ ان کے ایک قریب ترین شاگرد کیدار ناتھ شرما نے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں ایک اونچے گھرانے کی خاتون ان پر جان و دل سے فدا تھیں۔ پرویز صاحب بھی اس پر نثار تھے۔ وہ روزانہ شام کی سیاہی کے ساتھ ان کی خدمت میں آجاتیں۔ پرویز صاحب بھی روزانہ صبح سے ہی شام ہونے کے منتظر رہتے۔ یہ معاشقہ تقریباً سال بھر چلا۔ ایک زمانے میں ایک یہودی خاتون ارسلا کوہن جو کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم رکن تھیں اور کسی اعلی تجارتی کمپنی میں خاطر خواہ تنخواہ پر ملازم تھیں، پرویز شاہدی ان کے دام الفت میں گرفتار ہوگئے۔ یہ سلسلہ بھی بہت دنوں تک چلا۔ وہ خاتون پرویز صاحب پر اس قدر مہربان تھیں کہ اکثر مالی معاونت بھی کرتی تھیں۔ پرویز شاہدی کے ایک دوسرے عشق کا ذکر شیبانی ڈے سے بھی ملتا ہے۔ یہ ایک بنگالی خاتون تھیں اور کمیونسٹ پارٹی کی فعال رکن تھیں، عشق کا یہ سلسلہ بھی عارضی ثابت ہوا۔

بذلہ سنجی:

پرویز شاہدی نہایت ہی ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ حاضر جوابی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ طبعاً ہنسوڑ اور بے پرواتھے۔ اپنے چھوٹوں سے بھی اس طرح ملتے جیسے ہم عمروں سے ملا جاتا ہے۔ انداز گفتگو میں ایسی کشش تھی جو خواص وعوام کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔

مے نوشی:

پرویز شاہدی کی مے نوشی کے قصے بھی ایک زمانے میں عام تھے۔ احمد یوسف، مظہر امام، ابراہیم ہوش اور پرویز شاہدی کے ایک خاص عقیدت مند کیدار ناتھ شرما نے اپنے مضامین میں اس سمت اشارے کئے ہیں۔ احمد یوسف کہتے ہیں کہ پرویز شاہدی کچھ نہ کچھ شغل ضرور کرتے تھے؛ لیکن

انہیں ہم بلانوش نہیں کہہ سکتے۔انہوں نے دخترِ رز کو کبھی سر پر نہیں چڑھایا۔مظہر امام بیان فرماتے ہیں کہ جس دن تنخواہ ملتی، اس روز وہ اسکول سے فراغت پاتے ہی بار کا رخ کرتے اور مجھے بھی ہم نوشی کا شرف بخشتے۔کیدار ناتھ شرما نے لکھا ہے کہ شام کے سات بجے ہی پرویز صاحب کے کمرے کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔مدنا پور میں سب کو خبر تھی کہ پرویز صاحب شراب پیتے ہیں۔مئے نوشی میں مدہوشی کا ایک واقعہ ابراہیم ہوش یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''ہم دونوں شام کے وقت سنٹرل ایونیو میں واقع کلکتہ کیفے میں گھسے۔پرویز نے رم کے کئی جام لنڈھائے اور میں نے چائے پی۔اس دن ان کے پاس مدرسہ عالیہ کے ششماہی امتحان کے کچھ پرچے بھی تھے، جب وہ اٹھے تو مدہوشی میں پرچے اٹھانا بھول گئے اور ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر ایک رکشہ پر بیٹھ گئے، کچھ دور جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ پرویز صاحب اپنے ساتھ پرچے بھی لائے تھے، میں نے ان سے کہا کہ جناب والا آپ پرچے میخانہ میں چھوڑ آئے ہیں۔انہوں نے برجستہ کہا کہ گولی مارو پرچوں کو، سیدھے مشاعرہ میں چلو؛ لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور رکشہ والے سے واپس کلکتہ کیفے چلنے کے لیے کہا۔وہاں ایک کرسی پر پرچے رکھے ہوئے مل گئے۔مشاعرے کے دوسرے دن پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ ان سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۳۸)

سیاسی سرگرمیاں اور قید و بند:

پرویز شاہدی اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، جو کئی پشت سے مذہبیت اور صوفیانہ شعار پر کاربند تھا، چنانچہ عہدِ طفلی میں ان پر مذہبی اثرات کا مرتسم ہونا عین فطری تھا؛ لیکن جوانی کی سرحدوں کو عبور کرتے کرتے وہ اپنے ماحول سے بیزار ہو گئے۔یہ بیزاری دراصل اس مذہبی اور صوفیانہ ماحول کی دین تھی، جہاں سماجی سطح پر تضاد کا پہلو نمایاں تھا۔پرویز شاہدی ۱۹۳۵ء سے ہی ترقی پسندانہ افکار سے دلچسپی لینے لگے تھے اور مارکسی ادب اور فلسفے کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔۱۹۴۱ء میں جب وہ مدنا پور کالج میں استاد تھے، اسی زمانے میں کلکتہ میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔۱۹۴۷ء میں پرویز شاہدی کی کوششوں سے کلکتہ میں پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین کا زبردست اجتماع ہوا، ساتھ ہی کل ہند مشاعرہ بھی منعقد ہوا، جس میں ملک کے نامور کمیونسٹ شاعروں جوش ملیح آبادی، مجاز لکھنوی،

سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی وغیرہ نے شرکت کی۔اس کے بعد ترقی پسندوں پر حکومت کی نظر تیز ہو گئی۔پرویز شاہدی چونکہ کلکتہ میں اس تحریک کے روحِ رواں تھے اس لیے حکومت کا عتاب ان پر زیادہ نازل ہوا۔انجمن کے اراکین کے پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی۔حکومت کے لوگ انجمن کی نشستوں میں خفیہ طور پر شریک ہونے لگے، آخر کار ۱۹۴۹ء میں ایک رات اچانک پرویز شاہدی گرفتار کر لیے گئے اور پریسی ڈنسی جیل بھیج دئے گئے۔اس زمانے میں ان کا قیام چونا گلی میں اپنے بہنوئی سلیمان صاحب کے یہاں تھا۔پریسی ڈنسی جیل میں پرویز شاہدی نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر زبردست بھوک ہڑتال کی، مسلسل فاقے کئے، لاٹھی چارج ہونے سے زخمی بھی ہوئے، پھر انہیں بکسا اسپیشل جیل منتقل کر دیا گیا۔قید و بند کے دوران ہی انہوں نے متعدد معرکہ آرا نظمیں تخلیق کیں۔''رجز انقلاب''، ''تضاد''، ''بربط دل'' ''پال رابسن سے خطاب''، ''یانکسی کو سلام''، ''اسٹالن کی موت''، ''سرد جنگ''، ''الیکشن''، ''روشنی کو ووٹ دو''، ''قیدی گیت''، ''بانی'' وغیرہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔قید ہی کے دوران پرویز شاہدی کی ایک بہن اور اکلوتے بھائی انعام حسین کی شادیاں پٹنہ میں انجام پائیں۔پرویز شاہدی کی طویل نظم ''رقصِ حیات'' (گیارہ بند) اسی موقع کی یادگار ہے۔صرف دو بند ملاحظہ کیجئے:

انعام آرزوئے برادر ، نشاط جاں!
تسکین روح ، عیش تمنائے خانداں!
شادی تمہاری مژدۂ تعبیر گلستاں
خواب بہار تازہ کی تعبیر کامراں
وجد آفریں ترانۂ ساز خیال ہے
ایسے میں ضبط جوش مسرت محال ہے

کبریٰ مری عزیز بہن ، دل کی روشنی!
ماں جائے کا غرور ، بھرے گھر کی لاڈلی!
اترا رہی ہے روح کہ تم ہو دلہن بنی!
دل میں مچل رہی ہے مسرت کی راگنی

کب دور ہوں بہارطرب آفریں سے میں
سہرے کے پھول سونگھ رہا ہوں یہیں سے میں

اصناف ادب پر قدرت:

پرویز شاہدی شاعری کی مختلف اصناف پر قدرت رکھتے تھے۔خصوصی طور پر غزل گوئی،نظم نگاری اور رباعی گوئی پر انہیں قدرت کاملہ حاصل تھی۔عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بعض شعرا غزل پر تو مکمل دسترس رکھتے ہیں،لیکن نظم نگاری،رباعی گوئی یا دیگر اصناف سخن میں ان کی تخلیقی جودت کمزور دکھائی دیتی ہے۔پرویز شاہدی کے یہاں ہر جگہ ایک طاقتور اور توانا اظہار و بیان کا احساس ہوتا ہے۔غزل اور نظم کے علاوہ پرویز شاہدی نے صنف رباعی کو گہرائی و گیرائی سے آشنا کرایا ہے۔

شاعری کے علاوہ پرویز شاہدی ایک قابل لحاظ نثر نگار بھی تھے۔مختلف موضوعات پر ''جدید اردو'' کے لیے لکھے گئے ان کے اداریے اور شذرات بھی ان کے عمدہ نثر نگار ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔انہیں ترجمہ نگاری سے بھی غایت دلچسپی تھی۔ان کے تنقیدی مضامین اور تبصرے انہیں میدان نقد میں اعلیٰ مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ان کی زبان تخلیقیت کی چاشنی اور شیرینی سے لبریز ہے۔اس کی بہترین مثال ان کی سوانحی تحریر ''متاع فقیر'' مشمولہ: ''تثلیث حیات'' ہے۔ان کے تین اہم تنقیدی نوعیت کے مضامین ''مومن کی بت پرستی''، ''آج کا ادب'' اور ''بنگلہ ادب میں نئے رجحانات'' ماہنامہ ''زبان و ادب'' کے ''پرویز شاہدی نمبر'' (فروری مارچ ۱۹۸۰ء) میں بطور تبرکات شامل ہیں۔اسی طرح ان کے مکاتیب بھی سلیس اور شگفتہ نثر کی عمدہ مثال ہیں۔پرویز شاہدی کے انتقال کے ایک عرصہ بعد ۲۰۰۳ء میں ان کی بیگم فضیلت النسا کا مرتب کردہ مجموعہ ''مضامین پرویز شاہدی'' مغربی بنگال اردو اکادمی نے شائع کیا ہے، جس میں ان کے بعض اہم مکاتیب اور مضامین شامل ہیں۔

تصانیف:

پرویز شاہدی کے کلام کا پہلا مجموعہ ''رقص حیات'' مکتبۂ شاہراہ، دہلی کے زیر اہتمام جید برقی پریس، دہلی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔اس میں ۳۵ر نظمیں، ۳۰ر غزلیں اور ۴۱ر رباعیاں شامل ہیں۔''اشارات'' کے عنوان کے تحت ل احمد اکبرآبادی کی طویل تحریر (۲۱ر صفحات) بطور تقریظ شامل ہے، جس پر ۱۵ر جولائی ۱۹۵۶ء کی تاریخ درج ہے۔پرویز صاحب اپنے کلام کو کسی ڈائری

میں نقل کرنے کے قائل نہیں تھے۔یہ کام ان کے شاگردان اور حلقہ بگوشان انجام دیتے تھے۔ان کے ایک عزیز ترین شاگرد کیدار ناتھ شرما کا بیان ہے:

''ہر شام کو ہم ایک گھنٹہ کے لیے پرویز صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہو جاتے تھے۔یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا۔خاکسار نے فرش پر پڑے کاغذ کے پرزوں کو بٹورنا شروع کیا۔کوئی غزل ہوتی، کوئی نظم یا رباعیاں ہوتیں — ان کو میں نے ایک کاپی میں درج کرنا شروع کیا۔دو مہینے بعد کاپی بھر چکی تھی''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۸)

پرویز شاہدی کے ایک دوسرے رفیق شریف چکوالی نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں ان کا مجموعہ ''صبح نو'' کے نام سے ترتیب دیا تھا۔پرویز صاحب کی ایک پسندیدہ نظم ''گنگا'' تھی؛ اس لیے پرویز صاحب نے مجموعہ کا نام بقول مظہر امام ''ساز گنگ'' (ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۸۶) تجویز کیا؛ مگر کسی نے توجہ دلائی کہ اسے ''ساز گُنگ'' بھی پڑھا جا سکتا ہے۔مجموعہ کے نام کے سلسلے میں اویس احمد دوراں کا الگ بیان ہے:

''رقص حیات' کا نام پرویز صاحب نے 'سرود گنگ' رکھنا چاہا تھا مگر میں نے اس کے عوض 'رقص حیات' کا نام تجویز کیا، جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا....''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۹۳)

دوسری طرف مظہر امام لکھتے ہیں:

''۵۴ء کے اواخر میں ان کا مجموعہ میں نے از سر نو مرتب کیا اور شاہراہ بک ڈپو، دہلی کے مالک محمد یوسف جامعی کو آمادہ کیا کہ وہ اسے اپنے ادارے سے چھاپیں۔کچھ چیزوں کی شمولیت پرویز صاحب کی خواہش کے مطابق ہوئی، ہر چند میں اس کے حق میں نہ تھا۔ان ہی کی ایک نظم کی بنیاد پر میں نے مجموعے کا نام 'رقص حیات' تجویز کیا۔پرویز صاحب کو یہ نام بہت پسند آیا''۔

(ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۸۷)

پرویز شاہدی ''رقص حیات'' کی اشاعت سے مطمئن نہیں تھے۔ان کا خیال تھا کہ مکتبۂ شاہراہ سے ان کا مجموعہ شائع نہ ہوتا تو بہتر تھا۔اس باب میں شریف چکوالی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میرے مجموعہ کلام کی اتنی دلکش کتابت اور طباعت میری بد نصیبی کا ایک عکس ہے۔میرے معاملے میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے.....''۔

(ماہنامہ ’مریخ‘، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸)

البتہ شریف چکوالی کے نام اپنے ایک دوسرے مکتوب (۲۲/اپریل ۱۹۵۸ء) میں لکھتے ہیں کہ ''رقص حیات'' پٹنہ یونیورسٹی کے نصاب میں اردو ایم۔اے کے لیے شامل کرلی گئی ہے۔نظموں کی شوخ شفق رنگی سے خائف ہو کر صرف غزلیں ہی نصاب میں رکھی گئی ہیں؛ مگر یہ بھی غنیمت ہے۔

پرویز شاہدی اپنا دوسرا مجموعہ کلام ''تثلیث حیات'' اپنی زندگی میں ترتیب دے چکے تھے؛ لیکن یہ مجموعہ ان کے انتقال (۵/مئی ۱۹۶۸ء) کے چند ماہ بعد دسمبر ۱۹۶۸ء میں اسرار کریمی پریس، الہ آباد سے اشاعت پذیر ہوا۔اس میں ''متاع فقیر'' کے عنوان کے تحت پرویز شاہدی کا تحریر کردہ سات صفحات پر مشتمل دیباچہ بھی شامل ہے، جس پر ۲۹/اپریل ۱۹۶۸ء کی تاریخ درج ہے اور اس سے ان کے خاندانی پس منظر، شاعری اور نظریۂ شاعری پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔اسے ان کی مختصر سوانحی تحریر کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

''تثلیث حیات'' میں ۶۹/غزلیں اور ۳۰/نظمیں شامل ہیں۔۳/غزلیں اور ۹/نظمیں ایسی ہیں، جو ''رقص حیات'' میں بھی شامل تھیں۔فلیپ پر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ل احمد اکبرآبادی کی آرا شامل ہیں۔ ۲۳۵صفحات پر مشتمل اس مجموعے کے آخر میں ناشر کی طرف سے چند سطور شامل ہیں، جن میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ پرویز شاہدی کے تنقیدی مضامین، خطوط اور رباعیات زیر طبع ہیں۔

۲۰۰۵ء میں ''تثلیث حیات'' کا تازہ پاکستانی ایڈیشن ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع ہوا، جس کی ترتیب وتہذیب مظہر امام اور یوسف امام کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔تازہ پاکستانی ایڈیشن میں درج ذیل آٹھ غزلیں ''رقص حیات'' سے ماخوذ ہیں:

(۱) دل میں مرے خیال ہے تنہا نہ آپ کا
(۲) نقش قدم پہ میرے زمانہ رواں ہوا
(۳) تضادات سرمایہ داری نے مارا
(۴) دل بڑھا تھا گردش چشم عنایت دیکھ کر
(۵) چھوڑ لیں خود اپنی آنکھیں دیدہ ور ایسے بھی ہیں

(۶) نہ جانے کہہ گئے کیا آپ مسکرانے میں
(۷) تم خنک جذبہ ہو بیداری فن کیا جانو
(۸) دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے

''تثلیث حیات'' کے زیر نظر پاکستانی ایڈیشن میں ۳۲/نظمیں شامل ہیں۔تین نظمیں (خود ساختہ قیدی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سازش) جو ۱۹۶۸ء والے ایڈیشن میں تھیں، یہاں پس انداز کردی گئی ہیں اور پانچ نظمیں (بربط دل، میرا فنکار، ماضی کا قیدخانہ، ہم نوجواں ہیں اور تحقیر تحفہ) جو پرویز شاہدی کی پسندیدہ نظمیں تھیں، شامل کرلی گئی ہیں۔اسی طرح ''تثلیث حیات'' میں رباعیاں شامل نہیں تھیں، تازہ ایڈیشن میں ۶۰ منتخب رباعیاں بھی شامل ہیں۔

آخر میں ''کچھ نثر میں'' کے عنوان کے تحت خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحریر ''پرویز شاہدی'' (۱۹۶۸ء) اور مظہر امام کی تحریر ''ناقدوں کے مقتول: پرویز شاہدی'' (۱۹۶۸ء) کے علاوہ یوسف امام کی تحریر ''پرویز شاہدی اور ان کے کلام کی ترتیب نو'' شامل ہیں۔پہلے اندرونی فلیپ پر ادیب سہیل اور دوسرے فلیپ پر اختر پیامی کی مختصر آرا شامل ہیں۔اس طرح یہ اضافہ شدہ وترمیم شدہ ایڈیشن پرویز شاہدی کے شعری کردار کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

پرویز شاہدی کے انتقال کے ایک عرصہ بعد ان کی نثری نگارشات کا ایک مختصر مجموعہ ''مضامین پرویز شاہدی'' ۲۰۰۳ء میں مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ کے زیر اہتمام شائع ہوا، جس کی ترتیب کا کام پرویز شاہدی کی اہلیہ محترمہ فضیلت النسا (فضیلت پرویز) نے انجام دیا۔۱۴۸/صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اکادمی کے اس وقت کے سکریٹری جاوید اختر کی ''اپنی بات'' کے علاوہ پرویز شاہدی کے آٹھ مضامین اور بیالیس مکاتیب شامل ہیں، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

مضامین:

(۱) بنگلہ ادب میں نئے رجحانات (۲) آج کا ادب
(۳) مومن کی بت پرستی (۴) آتش
(۵) سودا (۶) چکبست کی شاعری
(۷) اردو ناول (۸) آج کا تنقیدی ادب

مکاتیب:

(۱)	بنام بیگم فضیلت النسا	-	۲۰
(۲)	بنام جناب شریف چکوالی	-	۸
(۳)	بنام جناب مظہر امام	-	۶
(۴)	بنام جناب امیر رضا	-	۱
(۵)	بنام بھابی	-	۴
(۶)	بنام محترمہ کبن	-	۳

وفات اور مدفن:

زندگی کے آخری حصے میں پرویز شاہدی کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بقول ڈاکٹر عبدالمنان وہ دل کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، دیگر محققین اور مورخین نے تنفس کا مرض بتایا ہے۔ یہ مرض انہیں ہمیشہ پریشان رکھتا تھا۔ بات کرتے کرتے نفس کی آمد وشد تیز ہو جاتی تھی، پھر اکثر راتوں کو نیند کی کمی بے چین رکھنے لگی۔ دواؤں کا سلسلہ تھا اور معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بقول علیم اللہ حالی:

''موت سے دو تین دن پہلے تک وہ باقاعدہ کلاس لینے کے لیے یونیورسٹی بھی گئے''۔

('پرویز شاہدی' (مونوگراف) علیم اللہ حالی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹)

اچانک ۴رمئی ۱۹۶۸ء کو ان پر بے ہوشی کا عالم طاری ہوا۔ فوراً ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا گیا۔ تنفس کے مریض تو تھے ہی، بے ہوشی کے سبب بے چینی حد سے سوا تھی۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور سکون کی خاطر نیند کا انجکشن لگا دیا جو ابدی نیند کا بہانہ بن گیا۔ شریف چکوالی کے نام بیگم پرویز کے خط (۱۶رمئی ۱۹۶۸ء) سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے:

''کچھ دن سے ان کی طبیعت خراب رہتی تھی؛ لیکن ان کی موت بالکل غیر متوقع تھی، نیند کی کمی سے بے چین رہتے تھے۔ ۴رمئی کی رات کو ڈاکٹر نے سونے کے لیے انجکشن لگایا اور انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ آپ کے دوست نے پھر آنکھیں نہ کھولیں''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۲)

۵رمئی کی شام سات بج کر پندرہ منٹ پر ۶رسرکس رینج، کلکتہ میں پرویز شاہدی نے آخری سانسیں لیں۔ انتقال کی خبر آن کی آن میں پوری ادبی دنیا کو سوگوار کر گئی۔ ان کے گھر لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اردو، ہندی، بنگلہ اور انگریزی کے تمام اخبار میں انتقال کی خبر جلی سرخیوں میں شائع ہوئی۔ دوسرے دن ۹ربجے جنازہ ۶رسرکس رینج سے گوبرا قبرستان کے لیے روانہ ہوا۔ لوگوں کا ایک ہجوم ساتھ ساتھ تھا۔ چاہنے والوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر چہار جانب سے جنازے پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس منظر کی تصویر سالک لکھنوی نے یوں اتاری ہے:

''مکان سے گوبرا قبرستان کم وبیش کوئی دو میل! سورج ابھی سے آنکھیں نکالے ہوئے۔ پارۂ حرارت ۴۱رڈگری سنٹی گریڈ۔ گرمی کی شدت، الامان والحفیظ! جنازہ اٹھا۔ سینکڑوں کاندھے حصہ لینے کے لیے بیتاب! راہ میں ایک بھیڑ نے جنازے کو روک لیا۔ کسی ٹریڈ یونین کا دفتر تھا اور لوگ منتظر تھے۔ دوٹوکرے یہاں بھرے ہوئے گلاب کے پھول جنازے پر انڈیل دئے گئے۔ جنازہ آگے بڑھا، کاندھے بدلتے رہے، بدلتے رہے .... دو میل کا سفر جیسے منٹوں میں ختم ہو گیا''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۴)

قبرستان میں ایک بڑا مجمع پہلے سے موجود تھا۔ کچھ انتظار کے بعد چاہنے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ گیارہ بجے مولانا کفیل احمد فاروقی نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہزاروں سوگوار چہروں اور پرنم آنکھوں کے ساتھ اردو کا عظیم انقلابی شاعر گوبرا قبرستان، کلکتہ میں آسودۂ خاک کر دیا گیا۔

اسی ماہ (مئی) کے ''صبح نو'' کے اداریے میں علیم اللہ حالی نے تعزیتی کلمات اس طرح پیش کئے:

''۵رمئی ۱۹۶۸ء کی بے رحم رات نے انسانی آبادی کے ایک اہم فرد کو ہم سے چھین لیا.... پرویز شاہدی کی موت ایسی نہیں ہے کہ جسے دنیا آسانی سے بھلا سکے گی .... اور دنیا روئے گی کہ اس کا ایک محسن اٹھ گیا.... غزل اپنی آنکھوں سے جوئے خوں بہائے گی، شگفتگی بیان اور زندہ دلی نالہ وشیون کرے گی۔ ایک فلسفہ، ایک نظریہ حیات روئے گا۔ ادارہ 'صبح نو' ہمیشہ ہمیشہ اس سانحہ پر غم کرتا رہے گا''۔

('راہ سخن' (اداریہ) علیم اللہ حالی، مشمولہ: ماہنامہ 'صبح نو' مئی ۱۹۶۸ء)

اردو کے مشہور شاعر اور پرویز شاہدی کے ہمدم دیرینہ علامہ جمیل مظہری نے کئی عزائیہ نظمیں،

قطعات اور رباعیات کے ذریعہ تاریخ وفات نکالی۔محض ایک نظم جو تینتیس (۳۳) اشعار پر مشتمل ہے، اس سے چند اشعار نقل کر رہا ہوں:

رونے والوں کے جگر خوں تھے گلابی تھی پھوہار
مرنے والے، تری بھیگی ہوئی تربت پہ نثار
آہ آہ خاک کا یہ ڈھیر ہے پرویز کی قبر!
یا ہے مستقبل فن تیری امیدوں کا مزار
تجھ سے پرویز تصور کی فضا تھی رنگیں
تجھ سے پرویز تھی جذبات کی دنیا بیدار
حسن کی ہے یہ تمنا کہ ہوں پھولوں کی جگہ
تیری تربت پہ حسینوں کے گلابی رخسار
عشق کا ہے یہ تقاضہ کہ دل اہل فراق
شمع کی طرح پگھلتے رہیں بالین مزار
تو کہ احباب کا پیارا تھا کسے تھی یہ خبر
تجھ پہ آجائے گا بے ساختہ اللہ کو پیار
خم بازوئے محبت نہ بنا طوق گلو!
ہوگئی موت کی باہیں تری گردن کا ہار
گریۂ دختر معصوم کی ندی کیا تھی!
جب اجل پھاند گئی ماں کی دعاؤں کا حصار
طبع آزاد پہ قیدیں تھیں تعین کی گراں
آخرش دل نے عناصر کی گرادی دیوار
باندھ کر رکھ نہ سکی تجھ کو وفا کی زنجیر
شوق اک جست میں اِس پار سے پہنچا اُس پار
مظہری دیکھتے ہیں تیری سواری کا جلوس

لیے آنکھوں میں تری تیز خرامی کا غبار!
ہے مری چشم تصور میں وہ ہنگام جمیل
جب کہ اک لاش ہوئی زینت آغوش مزار
فرض نے مجھ کو صدا دی بہ زبان ہاتف
یعنی آ دوست ہو پرویز کی میت پہ نثار
.... ۱۹۶۸ء ....
الوداع اے تپش افروز بیان غم دہر
السلام اے اثر آموز فغان دل زار!

بخوف طوالت پوری نظم نقل کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔جمیل مظہری نے مختلف موقعوں پر اپنی نظموں، رباعیوں اور متفرق اشعار میں پرویز شاہدی کا ماتم کیا ہے۔اس مختصر مونوگراف میں تمام ترعزائیہ اشعار کا پیش کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ یہاں مذکورہ اشعار کے علاوہ ایک رباعی مزید نقل کرنے کا جی چاہتا ہے:

پیری میں ذلیل و خوار ہونے کو جیے
تاریخ وفات سب کی کہنے کو جیے
اک بار قریب گور جا کر لوٹے
پرویز تمہارا داغ سہنے کو جیے

پرویز شاہدی کے ایک دوسرے ہم عصر اجتبیٰ رضوی نے اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

اس جینے پہ نفرین ہے اب تک میں جیا
احباب چھٹے خون جگر میں نے پیا
میرے لیے ایوب کا غم کیا کم تھا
صدحیف کہ پرویز نے بھی داغ دیا

سید حسن سرمد نے یوں تاریخ وفات نکالی:

ہر گھڑی افتاد کی دنیا ہے یہ
حادثوں سے زندگی لبریز ہے

گرچہ دلکش ہے بہت رقصِ حیات
خاتمہ اس کا ملال انگیز ہے

رونما ایسا ہوا ہے سانحہ
ہل عالم کا تنفس تیز ہے
ہوگئے دنیا سے رخصت شاہدی
یہ خبر کتنی قیامت خیز ہے

دیدۂ علم و ہنر ہے اشک بار
شاعری کی چشمِ نم خوں ریز ہے

دامنِ سرمد بھی ہے گریہ سے تر
''آہ کیا ہم کو غمِ پرویز ہے''
.... ۱۳۸۸ھ ....

❋

فن

غزل گوئی

پرویز شاہدی کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی۔ ابتدا میں انہوں نے ناسخ، آتش، سودا، داغ، غالب اور اقبال کے کلام اور طرز کلام سے اثرات قبول کئے۔ خصوصی طور پر ابتدا میں ان کی غزلوں پر ناسخ کے اثرات غالب رہے۔ ''تثلیث حیات'' کے دیباچہ بعنوان ''متاعِ فقیر'' میں انہوں نے خود لکھا ہے:

''.... دوستوں کو مرعوب کرنے کی دبی ہوئی خواہش نے ناسخ کے پرشکوہ رنگ سخن کی تقلید کا مشورہ دیا۔ ایک عرصہ تک اس رنگ میں مشق سخن کا سلسلہ قائم رہا''۔

('تثلیث حیات'، پرویز شاہدی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲)

پرویز شاہدی ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، نسلاً سید تھے، خاندان میں علم وادب، مذہبی ترفع اور صوفیانہ میلانات آپس میں شیر و شکر تھے، پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی خاندان کے دیگر افراد کی طرح معروف صوفی بزرگ سید شاہ منور علی کے سلسلے کے ایک بزرگ سید شاہ جمیل الرحمٰن چشتی نظامی کے ہاتھ بیعت بھی ہو چکے تھے۔ پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی، چنانچہ شاعری کے اوّلین دور میں بزرگوں کی وراثت انہیں زیادہ عزیز تھی اور ابتدائی شاعری پر مذہبی رنگ کا غلبہ اسی پرورش کا نتیجہ ہے:

وجہ وجود دہر محمدؐ کا نور تھا
ورنہ کہاں کلیم ، کہاں کوہ طور تھا
جتنی کہ راہ منزل الفت قریب تھی
اتنا ہی تیز شوق دل ناصبور تھا

بیسویں صدی کے چند اہم اردو شاعروں میں جہاں اقبال، فیض اور فراق کا نام لیا جاتا ہے، وہیں اس صف میں پرویز شاہدی بھی بلاشبہ نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری کی اصل نشو ونما بنگال میں ہوئی۔ یہاں کے انقلاب آگیں اور رومان پرور ماحول نے پرویز شاہدی کی غزلوں کو نئے رنگ وآہنگ سے آشنا کیا۔ پرویز شاہدی نے کلاسیکی شعری سرمائے کا بالاستعیاب مطالعہ کیا تھا۔ کلاسیکی شعری زبان اور اس کے نکات، شعر اور فن شعر پر ان کی نظر پہلے سے تھی، وقت کے ساتھ فنی محاسن، فکری پختگی اور شعری لطافتوں نے ان میں مزید گہرائی وگیرائی عطا کر دی۔

پرویز شاہدی عصری اعتبار سے اس عہد کے فنکار ہیں جب جدید لب ولہجے کی باضابطہ آمد نہیں ہوئی تھی۔ اردو شاعری اپنے روایتی پس منظر اور قدیم ڈھانچوں سے کچھ آگے بڑھ کر ترقی پسند تحریک کے تحت قدرے کھلے ماحول میں داخل ہو چکی تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ روایتوں میں مسلسل اسیر رہنے کے سبب اردو شاعری میں ایک ہلچل اور اضطراب کی سی کیفیت تھی۔ بندھے بندھائے لب ولہجے اور ایک مدت سے استعمال ہونے والے الفاظ وتراکیب اب اپنی معنویت کھونے لگے تھے۔ پرویز شاہدی کے ساتھ چلنے والے تمام باحوصلہ اور ہنرمند معاصرین جمود اور تعطل کی فضا کے خلاف تخلیقی تحریک کے نشانات بنا رہے تھے۔ جوش، ساغر، فراق، فیض، جمیل اور ساحر وغیرہ نے اس تخلیقی فضا کو بدلنے کی کامیاب کوششیں شروع کر دی تھیں، جس کے تحت اردو شاعری ایک نئے لہجے اور موڈ کے پیش نظر بیشتر شعرا سے ایک ہی سر اور تال کی پیش کش کا تقاضہ کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موضوعات میں تنوع پیدا ہونے لگا۔ بار بار استعمال ہونے والے الفاظ وتراکیب ترک کیے جانے لگے۔ ایک ہی دھن اور ایک ہی لے سے اکتاہٹ اور بیزاری کا اظہار ہونے لگا۔ شعری فکر میں نئے امکانات اور نئی جہتیں پیدا ہوئیں۔

علامتیں اپنی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر پس منظر اور انداز میں سامنے آنے لگیں۔ شاعری میں اتباع اور جانشینی کی روایت کمزور ہوتی گئی، اور فنکار آزاد تخلیقی تشخص کی طرف بڑھنے لگے۔ ظاہر

ہے اس فضا کی تعمیر میں سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب شاعری تفنن طبع کی حد تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ نئے مسائل حیات سامنے آ رہے تھے، ہندوستان میں انگریزوں کی رخصت اور ملکی حکومت کے قیام سے ایک سیاسی اتھل پتھل کی کیفیت تھی۔ اندرون ملک سماجی وسیاسی نظریات کی باہمی پیکار کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک مختلف جماعتوں اور نظریات سے وابستہ لوگوں کا نشانہ صرف یہ تھا کہ انگریز اس ملک سے چلے جائیں، ہندوستان کی سرزمین کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیں۔ اس جدوجہد میں ساری نظریاتی جماعتیں یک جہت تھیں، یہ الگ بات کہ ان میں باہمی اختلافات بھی موجود تھے۔ حصول آزادی کے بعد یہ اختلافات ابھرنے لگے اور مختلف نظریاتی گروہ اپنی سبقت اور بالادستی کے لیے برسر پیکار ہو گئے۔ کانگریس، مسلم لیگ، مسلمانوں میں مذہبی احیاپسندی کا رجحان، ہندوؤں کی رجعت پرستی، نئے آزاد ہندوستان میں اقتصادی اور سماجی نظام قائم کرنے کے سلسلے میں الگ الگ نظریاتی اختلافات، عوامی تحریک، پسماندہ طبقوں میں ایک ابال اور طبقاتی کشمکش کی وجہ سے ایک جدلیاتی ماحول کی آمد آمد ـــــــ غرض جب تک ہندوستان کی سرزمین برطانوی اقتدار سے آزاد نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اندرون ملک متعدد جماعتوں کے نظریات یک سمت اور یک جہت تھے؛ لیکن اب مسابقت اور مقابلے کی فضا تھی اور سب ایک دوسرے سے دست وگریبان ہو رہے تھے۔ ادھر نئے ہندوستان میں اقتصادی نظام کے نفاذ کا مسئلہ بھی سامنے تھا۔ عوام ذہنی طور پر بیدار ہو رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی بیداری نئے سیاسی خیموں کی تشکیل کر رہی تھی۔ اگر ایک طرف مذہبی احیاپسندی کی تحریک چل رہی تھی تو دوسری طرف مظلوم اور پسماندہ طبقوں کی بیداری ایک نیا سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ مانگ رہی تھی۔ اس پورے ماحول نے شعر وادب کو بھی متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں کوئی فنکار نئے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر محض پرانے سروں میں اپنے راگ نہیں الاپ سکتا تھا۔ حالات خود غور وفکر اور دانش وبینش کی دعوت دے رہے تھے۔ عوامی بیداری کا امنڈتا ہوا سیلاب فنکاروں کے ذہن پر بار بار دستک دے رہا تھا، چنانچہ اس عہد کے بیشتر اہم فنکاروں کے یہاں ادب کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کی بیداری کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یوں پرویز شاہدی کے دور میں شاعری تمام تر معاشرتی نظریات سے متاثر ہو کر ایک نیا رنگ وآہنگ اختیار کر چکی تھی۔

پرویز شاہدی کی ذہنی پرورش تو قدیم فکر ونظر کے ماحول میں ہوئی تھی؛ لیکن بہت جلد حالات

کی تبدیلی نے انہیں اس سیاسی اور سماجی شعور سے وابستہ کر دیا، جو اس عہد میں ایک طاقتور لہر کی طرح کام کر رہا تھا، چنانچہ پرویز شاہدی کا اختصاص یہ ہے کہ ایک طرف ان کی شاعری میں قدیم روایتی شاعری کی وہ خوبیاں ملتی ہیں، جو تمام بڑے شعرا سے منتقل ہوتی ہوئی ہماری شاعری کی ایک وراثت بن چکی تھی؛ لیکن چونکہ پرویز شاہدی کا ذہن نئے سیاسی وسماجی ماحول سے اچھی طرح وابستہ ہو چکا تھا؛ اس لیے اس رنگ قدیم میں ایک بالکل نیا تیور ہم آمیز ہو کر سامنے آ رہا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں: پرویز شاہدی کی شاعری روایت اور انقلاب کی مختلف تحریکوں اور لہروں کی آئینہ نما ہے اور اس طرح ہے کہ روایتی اسالیب پر نئے عصری مزاج اور نئے عصری تیور غالب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ غلبہ موضوعات کی سطح پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور شعری لب و لہجے، بحر و وزن کے تنوع، الفاظ و لغات کے استعمال اور تراکیب و اصطلاحات کی وضع بندی کی حیثیت سے بھی سامنے آتا ہے۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ان پڑھ آندھی گھس آتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
''اندر آنا منع ہے'' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

نظام مرگ مسلسل میں کیا سرور حیات
خود اپنی کھال کا ہے آدمی کفن پہنے

ہوائے تند میں یہ ریشمی خیمے نہ ٹھہریں گے
کہاں تک آزماؤ گے وفاداری طنابوں کی

راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حد نظر سے آگے بھی

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

پرویز شاہدی نے نئے الفاظ وتراکیب کے استعمال سے غزل میں رومانی لہجے کی پیش کش اور انقلابی موضوعات کے استعمال کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بے شمار حسین ترکیبیں ملتی

ہیں، جو خود ان کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ الفاظ کے بوقلموں حسن سے واقف تھے اور اسے برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ خوبصورت الفاظ وتراکیب کے کثرت سے استعمال نے ان کے لہجے میں وہ انفرادیت پیدا کر دی تھی، جو غالباً ان کے دوسرے معاصرین کے حصے میں کم آئی۔ انہوں نے یوں تو اپنی غزلوں میں بے شمار خوبصورت ترکیبیں وضع کیں اور استعمال کی ہیں، ان سبھوں کو بیک نشست یکجا نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی چند اشعار میں استعمال ہونے والی نادر ترکیبیں ملاحظہ ہوں:

کھو نہ جائے یورشِ تفصیل میں
فن، کہ خوش ایمائیوں کا نام ہے

ہائے و ہو جس کی ہو تنظیم جنوں کی دشمن
ایسے دیوانۂ آشفتہ نوا سے ڈریئے

ہر جلوہ کج کلاہی دل کا ہے منتظر
اہل نظر کا بھیس فقیرانہ کیوں رہے

بادصبا کی نرم خرامی کو کیا ہوا؟
غنچے ہلاکِ تیزیٔ رفتار کیوں ہوئے

پافگاران جنوں کا ہر قدم ہے لالہ کار
گلستاں در گلستاں شادابیاں صحرا میں ہیں

اذن شرکت ہی نہیں احساس یکجائی کو آج
محفلیں تو منتشر کتنی دلِ تنہا میں ہیں

نہ مہر و مہ میں رہے ہم نہ کہکشاں میں رہے
زمیں کے جائے تھے آغوش خاکداں میں رہے
عتاب لالہ و گل کو برا کہیں کیوں کر

چمن میں آگ لگی تھی ہم آشیاں میں رہے
کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

چارہ ساز اختلاج قلب گلشن کون ہو
اس کو بھی تو شوخیٔ نشو و نما کہتے ہیں آپ
اپنی طرز رہبری کا جائزہ لیتے نہیں
کارواں کی بے دلی کو ضعف پا کہتے ہیں آپ

قتل وقار عشق کا مجرم جہل ہوس کاراں ہی نہیں
ننگے اس حمام میں سب ہیں عالم کیا اور جاہل کیا

گرفت طوفاں میں آ گیا ہے خیال کا شعلہ پوش دامن
رہے حقیقت ہی جن سے روشن وہ خواب بھی بجھ کے رہ گئے ہیں
ہے منفعل ذوق شعلہ چینی، عرق عرق ہے جبین خرمن
کہاں سے آئیں گے برق پارے سحاب بھی بجھ کے رہ گئے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں استعمال ہونے والی نادر و نایاب ترکیبوں جیسے یورش تفصیل، تنظیم جنوں، کج کلاہی دل، ہلاک تیزی رفتار، پا فگاران جنوں، اذن شرکت، آغوش خاکداں، عتاب لالہ وگل، نگہ بادہ فروش، شوخی نشو و نما، طرز رہبری، قتل وقار عشق، خیال کا شعلہ پوش دامن، ذوق شعلہ چینی، جبین خرمن وغیرہ سے پرویز شاہدی کے تخلیقی مزاج کی انفرادیت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان فارسی تراکیب کے علاوہ پرویز شاہدی نے اپنے اشعار میں ایسے فقرے اور ٹکڑے بھی استعمال کئے ہیں، جن سے ان کی مخصوص تخلیقیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرویز شاہدی کی غزلوں کی اس خصوصیت کی طرف مظہر امام یوں اشارہ کرتے ہیں:

''موضوع اور مواد سے قطع نظر پرویز شاہدی کے یہاں فنکارانہ محاسن اتنے ہیں کہ اس وقت کے شاید ہی کسی شاعر کے یہاں اس حد تک موجود ہوں۔ انہوں نے

ایک ماہر صناع کی طرح الفاظ سے پیکر تراشے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت اور نادرہ کار ترکیبیں، تشبیہیں، ٹکڑے اور مصرعے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کی ایک مختصر فہرست پیش کرنا بھی یہاں مشکل ہے''۔

(ماہنامہ 'مریخ'، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۶۴)

پرویز شاہدی کی غزلیں شگفتگی، تازگی، ندرت اور فنکارانہ وقار سے مملو ہیں اور ان میں مقصدیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ باوجود اس کے ان کے یہاں کلاسیکی روایات کی چاشنی و لطافت موجود ہے۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تہذیبی موضوعات بھی ان کی غزلوں کا قوام ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں پائی جانے والی لطافت اور چاشنی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پرویز شاہدی طبعاً حسن و عشق کے دلدادہ تھے، انہیں حسن سے بھی لگاؤ تھا اور زندگی بھی عزیز تھی۔ انہوں نے شاعری کا آغاز بھی غزل گوئی سے کیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے شباب کے زمانہ میں بھی انہوں نے غزل کے بنیادی موضوعات سے انحراف نہیں کیا اور غزل کی صنفی پاکیزگی کا احترام کرتے رہے:

خاموشی بحران صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سناٹا سا چیخ رہا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
دل والوں کی خاموشی ہی بار سماعت ہوتی ہے
بے آوازی کرب فضا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سکتے تک اب آ پہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کرب سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
جب تک راہ وفا تھی سیدھی زور بیاں تھا عیش سفر
شاید کوئی موڑ آیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حد نظر سے آگے بھی
ہم سفری و راہبری میں حد فاصل کوئی نہیں
شام و سحر کے ساتھ بھی ہم ہیں شام و سحر سے آگے بھی

سوچ سمجھ کر اہل نظر نے شعلوں کی دنیا کو چنا
ورنہ نشیمن بن سکتا تھا برق و شرر سے آگے بھی

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا
کم سے کم میں غم دنیا کو بھلا سکتا تھا
پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا
اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

یہی وہ موسیقیت اور غنائیت ہے، جو پرویز شاہدی کو اپنے معاصرین میں ممتاز و ممیّز کرتی ہے۔

غزل بنیادی طور پر رمز وایما کا فن ہے۔ یہاں وضاحت اور تفصیل اکثر و بیشتر شعر کے حسن کی قاتل ہو جاتی ہے۔ پرویز شاہدی کا تعلق چونکہ شعری روایات اور اس کی دیرینہ وراثت سے بہت گہرا رہا ہے؛ اس لیے انہوں نے اپنے مزاج و انداز اور اپنے فکر و نظر کو اشعار میں سمونے کی جو کوششیں کی ہیں، ان میں بھی اردو غزل کی مستحکم روایت کے اثرات بار بار ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اپنی تخلیقی جودت میں پرویز شاہدی ہر جگہ اس نکتے کا دامن تھامے رہے کہ ہم روایت کے بغیر آگے کا سفر جاری نہیں رکھ سکتے؛ لیکن ہم اپنی انفرادیت کو روایت کے سہارے زندہ بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس طرح جب ہم پرویز شاہدی کو ہمعصر میلانات اور معاصر فنکاروں کی صف میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو روایت اور روایت سے رخصت کا ایک غیر معمولی فنکارانہ رویہ انہیں ممتاز اور نمایاں کرتا ہوا نظر آتا ہے:

کچھ دھوپ اور پڑنے دو افکار تازہ کی
ناپختہ ہیں نہال سخن کے ثمر ابھی

ہے بھول جانے کی کوشش بھی یاد کا اک نام
میں کامیاب کہاں ہوں تجھے بھلانے میں

دوستو! میں زندگی کے حسن سے برہم نہیں
میرے ماتھے پر نہ ڈھونڈو اپنے ماتھے کی شکن

باغ میں پھیلا ہی کب تھا صبح کی کرنوں کا جال
آبرو پھولوں کی لے کر اڑ گئی شبنم کہاں؟

تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو
آجایئے ذرا رخ روشن لیے ہوئے

ہیں مرے تصور میں ان کے سرخ رخسارے
اور انہیں سے دنیا کو گلستاں بنانا ہے

یہی عالم رہا گر میکدے میں تشنہ کامی کا
پڑے گا ہاتھ سے ساقی کے ساغر چھیننا مجھ کو

پرویز شاہدی کے تخلیقی امتیاز کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ ان کی شاعری اگر ایک طرف سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے اپنے عہد کے مد و جزر کی تصویر کشی کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے قاری کو ایک ایسے خواب سے سرشار بھی کرتی ہے، جس سے آنے والے دور کی تصویر جھلک جاتی ہے۔ ایک باشعور اور فکر و نظر کے حامل فنکار کی شاعری صرف اپنے دور کی آئینہ سامانی نہیں کرتی؛ بلکہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں ایک مستحکم اور توانا شعور عطا کرتی ہے۔ پرویز شاہدی کی شاعری جملہ تخلیقی خوبیوں کے لحاظ سے نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ اس خصوصیت سے بھی متصف ہے۔

پرویز شاہدی کی غزلیں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ان کی نظموں اور رباعیوں سے زیادہ ہیں اور فکری و فنی لحاظ سے بھی ان میں نئی تاب و توانائی، آنچ اور دھار موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں پرانی علامتیں اور تشبیہیں نئے تجربات کے اظہار کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور بعض اوقات بے پناہ خلاقانہ قوت کے سہارے نئی تشبیہیں اور علامتیں وضع بھی ہوئی ہیں:

ماہ و خور اگانے ہیں، کہکشاں بنانا ہے
اے زمیں! تجھی کو اب آسماں بنانا ہے
اپنے سرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو

بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے
میری زندگی میں تم اپنی دلکشی بھر دو
وقت جیسے ظالم کو مہرباں بنانا ہے
آج ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہیں تلواریں
دل کی آرزوؤں کو سخت جاں بنانا ہے

رگ رگ میں بھرتے جاتے ہیں شعلے حیات کے
خود شمع بنتا جاتا ہے پروانہ آپ کا
تولا نظر کے کانٹوں پہ جلووں کو آپ کے
میرے ہی دم سے حسن کا پلہ گراں ہوا

پرویز شاہدی کی غزلیں ہمیں ایک ایسی آگہی سے قریب کرتی ہیں، جہاں موضوعات کے کھردرے اور بے کیف استعمال کی بجائے تخلیقی استعمال پر زور ملتا ہے، ایسا تخلیقی استعمال جس کا سلسلہ ہماری مضبوط شعری روایات سے ملتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پرویز شاہدی نے اردو کی قدیم شعری روایات اور عہد جدید کے سلگتے ہوئے انسانی مسائل وموضوعات کے درمیان ایک قوس بنا کر دو عہد کو تخلیقی طور پر ملانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے پیچھے تخلیقی ہنرمندوں کا ایک کارواں نظر آتا ہے۔

نظم نگاری

پرویز شاہدی نے غزل کے ساتھ نظم نگاری میں بھی اعلیٰ تخلیقی جودت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نظم میں بھی ان کے یہاں طاقتور اور توانا اظہار وبیان کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے ایک عہد میں پرویز شاہدی نظم نگاری کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ نظم کی ہیئت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس میں کسی مخصوص موضوع کو تفصیل اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ یہ کام ہر شاعر سے نہیں ہوسکتا۔ عام طور سے غزلیہ شاعری زندگی کے منتشر؛ لیکن حسی اعتبار سے نہایت اہم تجربات پر مرکوز رہتی ہے۔ غزل میں تفصیل کی گنجائش نہیں رہتی، یہاں اشارے اور کنایے سے کام لیا جاتا ہے، یہ رمز وایما کا فن ہے۔ صراحت اور وضاحت جو پرویز شاہدی کی شعری شخصیت کا ایک اہم حصہ ہے، ظاہر ہے اس کا مظاہرہ

نظموں میں ہی ممکن تھا، چنانچہ پرویز شاہدی نے متنوع موضوعات کے سلسلے میں نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان میں کہیں مشاہدات کی دنیا آباد ہے تو کہیں پیغام، کہیں ترقی پسندانہ ذہن کی غمازی ہے تو کہیں تشکیک کی ژولیدگی، کہیں رومانی فکر ہے تو کہیں انقلاب آفریں لہجہ، کہیں فطرت کی عکاسی ہے تو کہیں سماجی مسائل سامنے آئے ہیں۔ غرض یہ کہ منظومات میں موضوعات کے تنوع نے پرویز شاہدی کے ذہن کو اچھی طرح منعکس کیا ہے، جس کے سبب ان کی شخصیت میں اضطراب مسلسل پایا جاتا ہے۔ نظموں سے گہری دلچسپی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پرویز شاہدی فطری طور پر رومان پسند بھی تھے اور متلون مزاج بھی، کسی ایک طریقے اور بندھے بندھائے اصول، یا فارمولے کا پابند ہوکر رہ جانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ نظم میں چونکہ ہیئتی تجربوں کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے؛ اس لیے یہ صنف ان کے مزاج کو زیادہ راس آتی ہے۔

پرویز شاہدی طبعاً رومان پسند ہونے کے باوجود انقلابی ذہن بھی رکھتے تھے اور حب الوطنی اور وطنیت کے جذبات سے بھی سرشار تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بعض اثر انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ حب الوطنی اور وطنیت کے جذبات کی عکاسی ان کی غزلوں کے اشعار میں بھی جابجا ہوئی ہے۔ نظموں میں ''تلوار'' اس سلسلے کی اہم نظم ہے۔ اس نظم کی تخلیق کا وہی زمانہ ہے، جب پورے ملک میں آزادی کی تحریک اپنے شباب پر تھی، ملک کے عوام بہرصورت بیدار تھے اور عزم واستقلال کا دامن تھامے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ ملک کے شاعر وادیب بھی ایسے ماحول میں ہم وطنوں کے جذبات کے ساتھ تھے۔ ایسے میں پرویز شاہدی کی نظم ''تلوار'' جہاں وطن سے محبت وعقیدت کی بہترین عکاس ہے، وہیں ہم وطنوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان کی غیرت کو للکارنے کا کام بھی انجام دیتی ہے:

قید غلامی میں ہے بھارت عبرت کی تصویر
قوم کے سینے میں چبھتی ہے سانس بھی بن کر تیر
اپنے وطن میں قیدی ہیں ہم پھوٹی ہے تقدیر
سات سمندر پار سے ڈھل کر آتی ہے زنجیر
کردے اس زنجیر کے اک اک حلقے کو بیکار
اے پیاری تلوار!

''ساز مستقبل'' پرویز شاہدی کی نمائندہ نظموں میں ہے۔ یہ ''رقص حیات'' کی پہلی نظم ہے اور

''تثلیث حیات''میں بھی شامل ہے۔اس کا شمار اردو کی شاہکار نظموں میں ہونا چاہئے۔نظم مختصر ہے اور رجائی انداز لیے ہوئے ہے۔شاعر کے دل میں مستقبل کا حسین خواب انگڑائیاں لیتا ہے، لمحات گنگناتے ہیں اور وہ نہایت فنکارانہ طور پر نادرہ کار ترکیبوں کے سہارے نظم کو حسین پیکر عطا کرتا ہے:

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں
کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل
ذہن بلبل کو گد گداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ
ابھی پردے میں مسکراتے ہیں
ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے
دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں
بے جلائے ہوئے دئے کتنے
رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں
کس نے چھیڑا ہے ساز مستقبل؟
آج لمحات گنگناتے ہیں

اصنام ناتراشیدہ کا پتھروں میں کسمسانا، ناشگفتہ لالہ وگل کا ذہن بلبل کو گدگدانا، ناسرائیدہ نغموں کا دل کے تاروں سے لپٹ جانا، رات ہوتے ہی بے جلائے ہوئے دیوں کا خود بخود جھلملانا نہ صرف اچھوتے شعری آہنگ کی طرف اشارہ ہے؛ بلکہ اس میں مستقبل کی بشارت بھی پوشیدہ ہے۔

''ماضی کا قید خانہ''میں کہنہ روایات اور فرسودہ خیالات کو نشانہ بنایا گیا ہے اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے۔شاعر کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے حال کو آسودہ اور مستقبل کو تابناک بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں خود کو ماضی کی قید سے آزاد کرنا ہوگا۔اس نظم کو نادر اور حسین ترکیبوں، آہنگ کی بلندی اور لفظوں کے پرشکوہ استعمال نے درخشندگی عطا کی ہے:

یہ برف پوش تمدن ، یہ منجمد تہذیب
شعاع مہر درخشاں کے انتظار میں ہے

یہ صدیوں، قرنوں کا ٹھٹھرا ہوا نظام حیات
تمازت دل انساں کے انتظار میں ہے
روایتوں کی یہ بے روح شام یخ بستہ
سحر کے شعلہ رقصاں کے انتظار میں ہے
یہ ژالہ بار تخیل ، یہ سرد سرد سی فکر
برشتگیٔ دل و جاں کے انتظار میں ہے
قدامتوں کا یہ انبار خشک و سرد و کثیف
دہکتی آگ کے طوفاں کے انتظار میں ہے
یہی ہے وقت کہ ہر سانس شعلہ افگن ہو
بھرا حیات کا برق و شرر سے دامن ہو

یہاں پرویز شاہدی نے بڑی نادر اور حسین ترکیبیں استعمال کی ہیں۔برف پوش تمدن، منجمد تہذیب، شعاع مہر درخشاں، ٹھٹھرا ہوا نظام حیات، تمازت دل انساں، شام یخ بستہ، ژالہ بار تخیل، برگشتگی دل وجاں، سرد سرد سی فکر جیسی ترکیبیں ایک ہی بند میں اس طرح استعمال ہوئی ہیں کہ معنوی حسن خود نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔سچ ہے کہ پرویز شاہدی ترکیبیں وضع کرنے اور ان میں ندرت ودل آویزی پیدا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔لفظوں کی تراش خراش اور خیالات ومحسوسات کی دلکشی فن پر مکمل قدرت کا ثبوت ہیں۔مجموعی اعتبار سے یہ ایک کامیاب اور عمدہ نظم ہے اور اس میں زندگی کی نئی تعبیریں موجزن ہیں۔

اپنی شیروانی کی بیسویں سال گرہ پر پرویز شاہدی نے ۱۷ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو چودہ بندوں پر مشتمل ایک طویل نظم ''گرم شیروانی''قلمبند کی تھی، جو''شاہراہ''، دہلی کے سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی، جس کا ایک بند اس طرح تھا:

اب تو مسک مسک کر فریاد کر رہی ہے
زخم رفو سے پہلو آباد کر رہی ہے
طرز فغاں انوکھی ایجاد کر رہی ہے
مجھ کو بھی ساتھ اپنے برباد کر رہی ہے

بیدی کے کوٹ سے لے کچھ درس سخت جانی
اے میری شیروانی!

اس بند کے پانچویں مصرعے کو نشان زد کر کے پرویز شاہدی نے فٹ نوٹ یوں لگایا تھا: ''بیدی کا ذاتی گرم کوٹ جسے ان کے علاوہ مختلف دوسرے افراد نے بھی وقتاً فوقتاً استعمال کیا ہے''۔ بعد میں مجموعہ میں شامل کرتے ہوئے پرویز شاہدی نے مذکورہ مصرعے کو بدل کر اس طرح کر دیا ''زاہد کے جہل سے لے کچھ درس سخت جانی''۔ اس نظم کو حرمت الاکرام نے اردو کے ان شہ پاروں میں شمار کیا ہے، جنہیں کسی زبان کے ادب کا سرمایہ افتخار کہا جا سکتا ہے۔

نظم ''تثلیث حیات'' پرویز شاہدی کی اکلوتی بیٹی سمینہ کی ولادت کے موقع کی تخلیق ہے اور بلا شبہ اس کا شمار اردو کی شاہکار نظموں میں ہونا چاہیے۔ اس نظم میں ماں، باپ اور بچی کی سہ رخی وحدت کو فلسفیانہ انداز و تیور عطا کیا گیا ہے۔ جودت فکر، شدت جذبات اور لہجے کا بے ساختہ پن نظم کو بلندی عطا کرتا ہے اور اس کے وقار کی ضمانت ہے۔ نظم ''بے چہرگی'' میں فکر کی تازہ آنچ نئے پیکر تراشتی ہے۔ آج کا انسان جس طرح چہروں کی بھیڑ میں کھو گیا ہے، راستوں کی تلاش میں گم کردۂ منزل ہو گیا ہے اور فریب کاری انا کی گرد اوڑھ کر ادھر ادھر بھٹک رہا ہے، اس نظم میں اس کی بہترین عکاسی ہوئی ہے:

ہزار چہرہ آدمی
ہزار چہرگی لیے
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو......
چہرہ چاہیے
خود اپنا چہرہ چاہیے
وہ اصلی چہرہ چاہیے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں!

پرویز شاہدی کی ایک نظم ''شکست'' ہے۔ اس میں بھی ابتدائے شباب کی حسین یادیں جلوہ ساماں نظر آتی ہیں۔ یہ نظم زندگی کی اس منزل میں کہی گئی ہے، جب شاعر پرانی یادوں کو دل سے نکال دینا چاہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہے۔ نظم طویل ہے، صرف چند اشعار دیکھئے:

ہوں خرد کے دور میں بھی میں پریشاں آج تک
ہے وہی سر میں جنون زلف پیچاں آج تک
فرصت عزلت گزینی ڈھونڈتا ہے ذوق فکر
پھر بھی ہے دل میں وہی ذوق بیاباں آج تک
عقل ہے ہر چند مصروف رفوئے پیرہن
چاک ہو جاتا ہے اس پر بھی گریباں آج تک

پرویز شاہدی کی ایک نظم ''تحقیر تحفہ'' ہے۔ یہ ابتدائے شباب کے جذباتی صدمے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ پرویز شاہدی کا رشتہ ان کے خاندان ہی کی ایک لڑکی سے ہونا قرار پایا تھا؛ مگر خاندانی چپقلش کی بنا پر یہ رشتہ انجام کو نہیں پہنچ سکا اور یہی صدمہ پرویز شاہدی کے ترک وطن کا سبب بھی بنا، چنانچہ اس نظم میں پرویز نے جھوٹی شان و شوکت کو مرکز میں رکھا ہے اور طنزیہ پیرایہ اختیار کیا ہے:

مانا کہ ہیں سونے سے لکھے جانے کے قابل
پرویز کے اشعار مگر زر تو نہیں ہیں
وہ ہوں فلک علم کے اک نیر تاباں
دولت میں مگر میرے برابر تو نہیں ہیں
وہ فکر میں ہوں رشک ارسطو بھی تو کیا ہے
اعزاز میں ہم چشم سکندر تو نہیں ہیں
کرتے ہیں وہ تقدیر کا ماتم بہت اچھا
پر نغمہ گر اوج مقدر تو نہیں ہیں
موتی سے بھی کچھ بڑھ کے سہی آب میں اشعار
قیمت میں مگر موتی سے بڑھ کر تو نہیں ہیں
مرعوب ہو کیوں حسن مرا ان کی نظر سے!
اک اچھے سے شاعر ہیں وہ افسر تو نہیں ہیں
کیا آئے ہو دینے مجھے پرویز کے تحفے
اشعار ہی اشعار ہیں، زیور تو نہیں ہیں

پرویز شاہدی کی ان نظموں کے مطالعے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ وہ نظم کی مختلف ساخت اور ہیئتوں میں بہترین تخلیقات پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے، جس دور میں وہ اپنی تخلیقات پیش کر رہے تھے، اس میں ترقی پسندی کے طفیل نظم نگاری میں ہیئت کے حوالے سے آزاد شاعری کا سلسلہ زور شور سے چل رہا تھا۔ پرویز شاہدی نے بھی ایسی آزاد نظمیں لکھی ہیں؛ لیکن ان کے دونوں مجموعوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر طبع آزمائی پابند شاعری کی ہیئت ہی میں کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرویز شاہدی کے ذہن کی تشکیل وتعمیر میں روایتی اقدار خاصے اثر انداز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پابند نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ اپنے عہد کے نہایت کامیاب اور نمایاں تخلیق کار ہونے کی وجہ سے پابند شاعری سے ہٹ کر آزاد نظم نگاری میں ان کی منظومات ''بے چہرگی'' اور ''آگ کی لکیر'' کی اہمیت اردو شاعری میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ ''شیروانی'' محض ایک دلچسپ اور تبسم آمیز نظم ہی نہیں ہے؛ بلکہ اس تخلیق سے ان کی ذہنی افتاد اور معاشرتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل پرویز شاہدی جیسا فن کار جس ہیئت وساخت کا انتخاب کرلے، اس میں کامیاب ترین تخلیقات پیش کرسکتا ہے۔

رباعی گوئی

اردو کے ممتاز رباعی گو شاعروں میں حالی، انیس، دبیر، اکبر، امجد، رواں، شاد، یگانہ، جوش اور فراق کے دوش بہ دوش سامنے آنے شعرا میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کے ہمراہ پرویز شاہدی کا نام بھی قابل احترام ہے۔ فن رباعی پر ان کی استادانہ گرفت جہاں ان کے خلاقانہ ذہن کا ثبوت ہے، وہیں تشبیہات واستعارات کی تزئین وآرائش اور زبان وبیان کی وارفتگی قارئین کے دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

رباعی کے سلسلے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ روایت پسند شعرا ہی اس صنف سخن میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہی طبقہ ہے جو اس کے فنی وفکری تقاضوں کی تکمیل کرسکتا ہے؛ لیکن اس بات کی تردید یوں ہوتی ہے کہ ہر عہد میں اساتذۂ فن نے رباعی کے ذریعہ اپنی فکری اور فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ عصری تغیرات کی وجہ سے آج رباعی کے بنیادی اور روایتی موضوعات میں تبدیلی بھی پیدا ہوئی ہے اور وسعت بھی۔ عام طور پر اکابر شعرا کے یہاں صنف رباعی پند ونصیحت، انسانی واخلاقی اقدار اور مذہبی جذبات کی ترسیل کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی گہرائیوں کے اظہار کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھی؛ لیکن رفتہ رفتہ رباعی نے اس لکشمن ریکھا کو پار کرلیا اور غزل کی طرح انسانی زندگی کے تمام تجربات ومحسوسات کی ترجمان بن

گئی، چنانچہ اگر جوش وجمیل نے اس میں فلسفیانہ مسائل کی پیشکش کی تو فراق نے قدیم ہندوستانی اساطیر اور تہذیب ومعاشرت کے ساتھ ساتھ محبوب کے سراپا کی نئی تصویریں اور تعبیریں پیش کیں۔ اسی طرح ترقی پسند شعرا نے انقلاب وانحراف کے نئے موضوعات پیش کرکے رباعی کی صنف کو مزید متمول کردیا۔

بیسویں صدی کے اردو شعرا میں جن چند نے غزل ونظم کے علاوہ رباعی گوئی کی طرف بھی توجہ کی ہے ان میں پرویز شاہدی بھی محترم ومعتبر ہیں۔ بنیادی طور پر غزل اور نظم سے مناسبت رکھنے کے باوجود پرویز شاہدی نے مختلف ومتنوع موضوعات پر خاصی تعداد میں رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام ''رقص حیات'' (۱۹۵۶ء) میں اکتالیس (۴۱) رباعیاں شامل ہیں۔ ''تثلیث حیات'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۶۸ء) میں رباعیاں نہیں ہیں؛ لیکن تازہ پاکستانی ایڈیشن (۲۰۰۵ء) میں ساٹھ (۶۰) رباعیاں ملتی ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں شاہد ساز کی مرتبہ کتاب ''رباعیات پرویز شاہدی'' اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتا سے منظر عام پر آئی ہے، جس میں ایک سو چورانوے (۱۹۴) رباعیاں شامل ہیں۔ ظاہر ہے یہاں یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ شاہد ساز نے پرویز شاہدی کی تمام رباعیاں سمیٹ لی ہیں۔ خود شاہد ساز کا خیال ہے کہ:

> ''اگر تحقیق وتفتیش کی جائے تو متعدد رباعیاں دیگر رسالوں سے مزید حاصل کی جاسکتی ہیں؛ اس لیے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ پیش کردہ رباعیوں کی تعداد حتمی ہے اور یہ رباعیاں 'حرف آخر' کی حیثیت رکھتی ہیں''۔

('رباعیات پرویز شاہدی'، مرتب: شاہد ساز، اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتا، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱)

پرویز شاہدی نے رباعی کی تخلیق کرتے ہوئے اس کے روایتی مزاج ومنہاج، وقار واعتبار اور طرز اظہار کی طرف خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں میں مجموعی طور پر انحراف وانقلاب کی جو شعاعیں پھوٹتی ہیں اور جن سے پرویز شاہدی کے رنگ سخن کو امتیاز واختصاص حاصل ہوتا ہے وہ انقلاب آفریں لہجہ ان کی رباعیوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے، یہ الگ بات کہ اس کی لے قدرے مدھم ہے۔ رباعیوں میں پرویز شاہدی کا ذہن ایک مفکر اور مفاہمت پسند فنکار کا پتہ دیتا ہے، البتہ کہیں کہیں رباعیوں میں ان کے انقلابی ذہن کا نیا ذائقہ اور فکر کی نئی تجلیاں سر ابھارتی نظر آتی ہیں:

کیا رنگ زمین و آسماں ہے ساقی
اترا ہوا چہرۂ جہاں ہے ساقی

لودینے لگیں وقت کے عارض جس سے
وہ بہتی ہوئی آگ کہاں ہے ساقی

ہرپتے میں اک دھار لیے چٹکیں گے
ہر سانس میں تلوار لیے چٹکیں گے
دہکے ہوئے فولاد کے ہیں ہم غنچے
چٹکیں گے تو جھنکار لیے چٹکیں گے

زنجیر کا لوہا بھی پگھل جائے گا
شمشیرہی کے سانچے میں ڈھل جائے گا
شعلے دل باغی کے بڑے سرکش ہیں
جو سامنے آئے گا وہ جل جائے گا

پرویز شاہدی کی رباعیوں میں بھی ان کی غزلوں کی طرح پختہ کاری کے تمام تر نشانات موجود ہیں۔ رباعی میں استعمال ہونے والے تمام مروجہ موضوعات مثلاً رندی وسرمستی، ادب وفلسفہ، مذہب واخلاق، مناظر قدرت، بے ثباتی عالم، صوفیانہ مضامین، انقلاب وانحراف وغیرہ سب ان کے یہاں موجود ہیں:

ہونٹوں کو خوشی کا راگ دینا ساقی
بہتی ہوئی سرخ آگ دینا ساقی
دنیاہے جواں مانگ رہی ہے سیندور
دینا ساقی سہاگ دینا ساقی
ہے ساری فضا میں ایک ہلچل ساقی
کیا دیر ہے کھول بھی دے بوتل
ساقی برسات کی شب ہے آب رنگیں
برسا چھاتے نہیں روز روز بادل ساقی

جب مذہب واخلاق، تفکروتفلسف، قدرت اورمناظر قدرت، حمد ومناجات اور بے ثباتی عالم کے ذکر کی طرف آتے ہیں تو فکرونظر کی گہرائی اور ترسیل معانی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے:

طوفان میں کسی کا آسرا بے معنی
ہرچیز یہاں اپنے سوا بے معنی
آغوش تلاطم میں ہے کشتی رقصاں
ایسے میں خیال ناخدا بے معنی

ذروں کو کیا مہر بدامن تو نے
ریگوں میں دکھایا نور ایمن تو نے
پروانہ صفت ہے عقل اب تک بیتاب
کیاخوب کیا چراغ روشن تو نے

تھی کون سی شے ارض وفلک سے پہلے
تخلیق سما ، خلق سمک سے پہلے
حیرت میں نہ پڑ، وقت بہت ہے اے عقل
کچھ آگے تو بڑھ لے حدِ شک سے پہلے

پرویز شاہدی غزل گواورنظم نگارشعرا میں ہرچند کہ اپناانفرادی مقام رکھتے ہیں؛ مگران کی رباعیوں کا جہان وہ جہان دیگر لیے ہوئے ہے، جس سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا۔ رباعی وہ صنف سخن ہے، جوفنکار سے مسلسل ریاض اور مشق ومزاولت کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگراصناف کے مقابلے میں رباعی گوشعرا کی تعداد کم ہے اور رباعی گوشعرا کی اس مختصر فہرست میں بھی پرویز شاہدی کی رباعیاں دور سے ہی اپنے خالق کا پتہ دیتی ہیں۔ ادیب سہیل نے ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک اجلاس کا ذکر کیا ہے، جوجوش ملیح آبادی کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ انجمن کے صدر ہونے کی حیثیت سے پرویز شاہدی اجلاس میں موجود تھے اور میز بانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس محفل میں جب اہل ذوق نے جوش ملیح آبادی سے تازہ رباعیاں سنانے کی فرمائش کی تو جوش نے پُر جوش انداز میں کہا:

"بھئی میں تو تمہاری فرمائش کو پورا کرتا رہتا ہوں، تمہارے درمیان تو خود ایک معتبر رباعی گو موجود ہے"۔

('تثلیث حیات'، مرتبین: مظہر امام و یوسف امام، ۲۰۰۵ء (اندرونی فلیپ کی تحریر)

پرویز شاہدی مشاعروں میں غزل، یا نظم سنانے سے پہلے اکثر و بیشتر رباعیاں پیش کرتے تھے۔ یہ رباعیاں اتنی متاثر کن اور عصری تقاضوں سے مملو ہوتیں کہ سامعین کے دلوں کو مسخر کر لیتیں۔ بقول علیم اللہ حالی:

"....اکثر مشاعروں میں نظم اور غزل سنانے سے پہلے وہ چند رباعیات ضرور سنایا کرتے تھے۔ ان کی رباعیوں کی خصوصیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اکثر و بیشتر رباعیوں سے ہی وہ مشاعرہ لوٹ لیتے تھے اور پرویز شاہدی کے بعد دوسرے تمام شعرا پھیکے پڑ جاتے تھے.... پرویز شاہدی کی رباعیات مشاعروں میں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کے سامنے خود ان کی اپنی غزلیں مشاعروں میں پھیکی پڑنے لگیں۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو انہوں نے مشاعروں میں رباعیاں پڑھنا ترک کر دیا۔ غرض کہیں نہ کہیں ان کی رباعیاں ان کی غزلوں کی حریف بن گئیں"۔

('پرویز شاہدی' (مونوگراف) علیم اللہ حالی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۴۹-۵۰)

پرویز شاہدی کی رباعیوں کا ابتدائی رنگ رومان و شباب، رندی و سرمستی، نشاط و کیف اور معاملات حسن و عشق کے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے:

ہونٹوں کی شراب اب پلا دے ساقی
رگ رگ میں اک آگ سی لگا دے ساقی
تاریک ہوئی جاتی ہے بزم ہستی
ساقی! تو مسکرا دے ساقی

رنگت اس میں روپہلی راتوں کی ہے
نرمی اس میں پرانی گھاتوں کی ہے
تلخی گھلتی ہے اس کی دھیرے دھیرے
حلوے میں مٹھاس تمہاری باتوں کی ہے

ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل پرویز شاہدی کی شاعری میں بیش از بیش ملتے ہیں، چنانچہ ان کی رباعیاں بھی نئے مسائل حیات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں۔ معاشرے کا کھوکھلا پن اور سرمایہ دارانہ نظام کے جبر سے تنگ آ کر پرویز شاہدی اس میں تبدیلی کے خواہاں نظر آتے ہیں:

برہم ہیں قدامتیں تو ہونے بھی دے
سوتی ہیں جہالتیں تو سونے بھی دے
اے مہر مبین صبح نو ہنستا جا
روتی ہیں روایتیں تو رونے بھی دے

بے ہودہ قدامتیں لیے بیٹھے ہو
فرسودہ شریعتیں لیے بیٹھے ہو
ہے آج نئے نظام عالم کی تلاش
تم کل کی روایتیں لیے بیٹھے ہو

پرویز شاہدی کی غزلوں اور نظموں میں جہاں گہرائی، گیرائی اور فکری و فنی ارتقا پایا جاتا ہے، وہیں ان کی رباعیوں میں بھی ایک خلاق ذہن کی کارفرمائیاں ملتی ہیں۔ اپنی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کی طرح پرویز شاہدی نے رباعیات میں بھی خوبصورت ترکیبیں وضع کر کے اور ان سے نئے موضوعات کی تخلیق کر کے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔

نثر نگاری

پرویز شاہدی بنیادی طور پر شاعر تھے، مگر انہوں نے بعض اہم نثری نگارشات بھی پیش کی ہیں، جن میں ڈرامے، علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین، تقاریظ و تبصرے، پیش لفظ، دیباچے، ترجمے اور مکاتیب شامل ہیں۔ ماہنامہ "جدید اردو" کلکتہ کے مدیر ہونے کی حیثیت سے تقریباً دس برسوں تک وقتاً فوقتاً اس کے اداریے کے علاوہ "شذرات" اور "معروضات" کے عنوان سے نہایت اہم اور قیمتی نثری تحریریں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی آخری نثری سوانحی تحریر "متاع فقیر" (۲۹/اپریل ۱۹۶۸ء) مشمولہ "تثلیث حیات" اس امر پر دال ہے کہ پرویز شاہدی کے یہاں نثر نگاری میں بھی تدریجی ارتقا ہوا ہے۔

انہوں نے بعض تحریریں نصابی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر بھی لکھیں اور بعض کا تعلق ریڈیو نشریات سے ہے۔انگریزی، بنگلہ اور ہندی زبانوں کی بعض اہم تحریروں خصوصاً ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔عبدالرحمٰن (امرامیری) نے اپنے تحقیقی مقالے ''پرویز شاہدی بحیثیت شاعر'' میں ان کی نثری تحریروں کا تفصیلی گوشوارہ پیش کیا ہے۔علیم اللہ حالی نے اپنے مونوگراف ''پرویز شاہدی'' میں اسی حوالے سے پرویز شاہدی کی نثری نگارشات کی تفصیل پیش کی ہے، جو اس طرح ہے:

(۱)	مومن کی بت پرستی	مضمون
(۲)	چکبست کی شاعری	مضمون
(۳)	آج کا تنقیدی ادب	مضمون
(۴)	اردو ادب آزادی کے بعد	ریڈیو ٹاک
(۵)	آج کا ادب	ریڈیو ٹاک
(۶)	بنگلہ ادب میں نئے رجحانات	ریڈیو ٹاک
(۷)	اعجاز کتابت	ڈرامہ
(۸)	طلسمی طوطا	افسانہ
(۹)	خطبہ صدارت	صدارتی تقریر
(۱۰)	روداد مشاعرہ	رپورتاژ
(۱۱)	دیباچہ (اجالوں کے گیت)	تقریظ
(۱۲)	دلاور حسین سے مضطر حیدری تک	تقریظ
(۱۳)	اشک اور سیل اشک	تقریظ
(۱۴)	تعارف (پھول اور کلیاں)	تقریظ
(۱۵)	پیش لفظ (منزل کہاں ہے تیری)	تقریظ
(۱۶)	شمعدان	ترجمہ
(۱۷)	پست قد آدمی	ترجمہ
(۱۸)	تقریظ (تیر و ترکش)	تقریظ
(۱۹)	عزم حیات	شخصیات

ماہنامہ ''جدید اردو'' کلکتہ کے مختلف شماروں میں شذرات اور معروضات کے عنوان سے پرویز شاہدی کی نثری تحریروں کی تفصیل یوں ہے:

(۱) [الف] کچھ اپنے متعلق
[ب] ہندوستان کے نقادانِ ادب

(۲) [الف] ہندوستانی
[ب] اردو کانفرنس

(۳) [الف] حقیقت اسلام
[ب] میلادالنبی

(۴) جدید اردو کی دشواریاں

(۵) [الف] عذر لنگ
[ب] بزم احباب
[ج] بزم احباب کلکتہ کا سالانہ جلسہ
[د] سر عبدالکریم غزنوی مرحوم

(۶) [الف] احوال واقعی
[ب] طلب معافی
[ج] حادثہ جانکاہ

(۷) ایک تلخ حقیقت

(۸) [الف] انجمن ترقی اردو (کلکتہ)
[ب] بزم اردو (کلکتہ)

(۹) پٹنے کا دورہ

(۱۰) [الف] نکتہ چینوں سے
[ب] معذرت

(۱۱) [الف] بلاعنوان
[ب] جدید اردو کا سالنامہ

(۱۲) بلاعنوان

(۱۳) [الف] آل انڈیا ریڈیو

[ب] ہدیہ تہنیت

(۱۴) [الف] بلاعنوان

[ب] بزم شعرائے بنگال

(۱۵) [الف] سالنامہ ۱۹۴۱ء

[ب] خان بہادر عبدالمقتدر صاحب مرحوم

(۱۶) [الف] سالنامہ کے متعلق

[ب] شخصیت پرستی

(۱۷) انجمن ترقی اردو

(۱۸) [الف] ٹیگور

[ب] جنون عقیدت

(۱۹) [الف] پٹنہ اور گیا کا دورہ

[ب] ماتم

(۲۰) [الف] موجودہ جنگ

[ب] ناظرین جدید اردو سے

[ج] آل انڈیا ریڈیو سے

(۲۱) [الف] ایک خطرناک جماعت

[ب] مظالم کی گرم بازاری

(۲۲) [الف] موجودہ جنگ اور ہندوستان

[ب] تعزیت

[ج] یادگار کی ضرورت

(۲۳) [الف] اتحاد کی ضرورت

[ب] تعزیت

(۲۴) دوسرے محاذ جنگ کی ضرورت

(۲۵) بلاعنوان

(۲۶) خطرہ

(۲۷) [الف] سالنامہ جدید اردو کے متعلق

[ب] تہنیت

[ج] ایک گہرا زخم

(۲۸) [الف] کلکتہ کی بم باری

[ب] جدید اردو کا مستقبل

(۲۹) [الف] دعوت جنگ

[ب] جنگ اور ادب

(۳۰) [الف] مہاتما گاندھی

[ب] جمشید پور کا مشاعرہ

(۳۱) تعزیت

(۳۲) عید مبارک

(۳۳) [الف] بلاعنوان

[ب] بلاعنوان

پرویز شاہدی نے اپنے رسالے ''جدید اردو'' میں ''نقد ونظر'' کے عنوان سے مختلف کتب ورسائل پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ان تاثرات اور تبصروں کی تفصیل یوں ہے:

(۱) رسائل سلسلہ تعلیم وترقی

(۲) [الف] سلسلہ مطبوعات شعبہ سائنس

[ب] پانی کی کہانی خود اس کی زبانی

[ج] آب دوز کشتیاں اور سب رنگ

(۳) سب رنگ کتاب گھر حیدرآباد کی چند نادر کتابیں

[الف] اردو کے اسالیب بیان

[ب] تاریخ ادب اردو
[ج] ''ہمایوں'' کا سالگرہ نمبر
[د] ''سہیل'' گیا کا افسانہ نمبر

(۴) عشرت گیاوی کے سو شعر بہ اسم تاریخی صد برگ گل جاوید عشرت
(۵) اردو انسائیکلو پیڈیا
(۶) اسلامی انسائیکلو پیڈیا
(۷) عورت کی بپتا
(۸) خزینہ رباعیات
(۹) رسالہ ''سہیل'' گیا
(۱۰) مکتبہ جامعہ کے چار سیاسی رسائل
(۱۱) بحر الکاہل کی سیاست
(۱۲) ناسیت
(۱۳) ممالک اسلامیہ کی سیاست
(۱۴) قومیت اور بین الاقوامیت

جیسا کہ ذکر ہوا پرویز شاہدی کی نثری نگارشات کے مذکورہ گوشوارہ کے مرتب عبدالرحمٰن ہیں، جنہوں نے یہ گوشوارہ مختلف اخبار و جرائد اور دیگر معتبر ذرائع سے نہایت عرق ریزی سے مرتب کر کے اپنے تحقیقی مقالے میں شامل کیا تھا۔ اس مقالے پر انہیں ۱۹۸۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ بقول رئیس انور:

> ''مصنف نے سوانح نگاری اور تنقید کلام کے علاوہ چھان بین کر کے پرویز کے ڈراموں، مقالوں، تبصروں اور تقریظوں کی تفصیل بھی پیش کی ہے، جو بڑی کارآمد اور معلومات افزا ہے۔ مقالہ بڑی محنت اور تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے''۔

('بازیافت پرویز شاہدی'، مرتب: رئیس انور، لیبل آرٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹)

نثری تحریروں کی مندرج تفصیلات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پرویز شاہدی نے کسی ایک میدان خاص، یا تعین شدہ موضوع پر لکھنے کی بجائے جو موضوع ان کے سامنے آیا، یا جس موضوع

پر لکھنے کی ان سے فرمائش کی گئی، اس سے متعلق تجربات و مشاہدات پیش کئے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ ''مومن کی بت پرستی''، ''اردو ادب آزادی کے بعد'' اور ''بنگلہ ادب میں نئے رجحانات'' جیسے مضامین لکھ کر اپنی ادبی اور تخلیقی و تنقیدی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو دوسری طرف مشاعرے کی روداد اور شخصیات سے متعلق مضامین بھی لکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا فہرست میں اسلام اور اسلامیات سے متعلق ان کی تحریریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اپنی تحریروں ''حقیقت اسلام'' اور ''میلاد النبیؐ'' وغیرہ میں انہوں نے مذہب کی تفہیم کے لیے عقلی اور منطقی دلائل پر زور دیا ہے۔ ''حقیقت اسلام'' دراصل ''جدید اردو'' مئی ۱۹۳۹ء کا اداریہ ہے، جس میں انہوں نے مذہب اسلام میں پائے جانے والے مساوات اور رواداری پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ انہیں اس بات کا غم ہے کہ ہم نے اپنی بعض غیر اخلاقی حرکات کے سبب اسلام کے وقار کو خود مجروح کیا ہے۔ اسی طرح ''میلاد النبیؐ'' میں پیشہ ور میلاد خوانوں کی ان ولولہ انگیز تقریروں کی مذمت کی ہے، جس کے پس پردہ اکثر اوقات اہانت کا پہلو پوشیدہ رہتا ہے۔

پرویز شاہدی اشتراکی نظریات کے حامل تھے؛ لیکن جب ہم ان کی مذکورہ تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی بعض تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مذہب اور ایک صحیح مذہب کا فیض یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے معاشرے میں انسانی اور اخلاقی اقدار قائم ہو سکے اور اسلام ان نکات پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔

مضامین، تبصرے، تقاریظ، تعارف کتب، دیباچے اور عصری سیاسی حالات سے متعلق پرویز شاہدی کی نثری تحریروں کے علاوہ ان کے خطوط بھی ملتے ہیں۔ ''مضامین پرویز شاہدی'' میں شامل بیالیس (۴۲) مکاتیب میں بیس (۲۰) مکاتیب ایسے ہیں، جو انہوں نے اپنی بیگم فضیلت النسا کو لکھے ہیں۔ پرویز شاہدی کے قریب ترین نیاز مندوں میں شریف چکوالی بھی تھے، ان کے نام آٹھ (۸) مکاتیب، مظہر امام کے نام چھ (۶)، امیر رضا کاظمی کے نام ایک (۱)، بھابی کے نام چار (۴) اور اپنی بہن کبن کے نام تین (۳) مکاتیب شامل کتاب ہیں۔ یہ مکاتیب نہایت اہم ہیں اور ان سے پرویز شاہدی کی ذہنی افتاد اور فکر و نظر کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان خطوط میں ذاتی احوال کے علاوہ علمی و ادبی باتیں بھی ملتی ہیں۔ مطالعے اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے مظہر امام اور امیر رضا کاظمی کے نام لکھے گئے مکاتیب زیادہ اہم ہیں۔

انتخاب کلام

بیس منتخب غزلیں ٭ دس منتخب نظمیں ٭ بیس منتخب رباعیات

منتخب غزلیں

[۱]

تم خنک جذبہ ہو بیتابیٔ فن کیا جانو؟
کیا گزرتی ہے دم فکر سخن کیا جانو؟
خون ہے دل میں تمہارے ابھی افسردہ خرام
سرخ کیوں ہوتے ہیں رخسار چمن کیا جانو؟
میں ہوں کتنے قد و گیسو کے جہاں کا معمار
سرگراں مجھ سے ہیں کیوں دار و رسن کیا جانو؟
تم تو کرتے ہو مری کلک سخن کو پا بند
کون ہے کاتب تقدیر وطن کیا جانو؟
میں کہ ہوں خاک نشیں دشمن جام خسرو
میں ہی پیتا ہوں مئے تخت فگن کیا جانو؟
تم کو ہے ناز کہ جکڑے ہوئے ہو وقت پاؤں
کیوں بدلتا ہے زمانے کا چلن کیا جانو؟

تم سمجھتے ہی نہیں اہل گلستاں کی زباں
مجھ سے کیا کہتے ہیں یہ سرو وسمن کیا جانو؟
تم تو ہو باعث افسردگی اہل ہنر
میں ہوں تابانی مستقبل فن کیا جانو؟
جن کو تم دیتے ہو شوریدہ سری کا الزام
ہیں وہی خاک بسر تاج شکن کیا جانو؟

[۲]

بے باک ہیں پاداش خطا سے نہیں ڈرتے
ہم عشق کے مجرم ہیں سزا سے نہیں ڈرتے
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں صبح رخ جاناں
ہم تیرگی شام بلا سے نہیں ڈرتے
پندار وفا ضامن بیباکی دل ہے
ہم حوصلہ اہل جفا سے نہیں ڈرتے
عجز رسن و دار کا عالم ہے نظر میں
ہم طوق و سلاسل کی فضا سے نہیں ڈرتے
ہیں شمع سر راہ تو روشن ہی رہیں گے
ہم دامن رہزن کی ہوا سے نہیں ڈرتے
بارود بچھانے کو تو آئے ہو چمن میں
کیا برہمی موج صبا سے نہیں ڈرتے؟
کیوں گھیر رہے ہیں گل و گلزار کو شعلے
کیا ابر بہاراں کی سزا سے نہیں ڈرتے؟
یہ تاج کے سائے میں زر و سیم کے خرمن
کیوں آتش کشکول گدا سے نہیں ڈرتے؟
اتنا بھی کوئی محو جفا میں نہیں ہوتا
تم ولولہ اہل وفا سے نہیں ڈرتے؟

قاروں کی شریعت پہ ہے اب شیخ کا ایماں
مسجد میں تو جاتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے

[۳]

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو آدمی نہیں کہتے
داغ دار اجالے پر ، یہ سحر نہ اترائے
برص کی سفیدی کو روشنی نہیں کہتے
ہے حیات اک شورش منزل آفرینی کی
آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہیں کہتے
مژدۂ مسرت کیوں آپ لے کے آئے ہیں
کپکپی کو ہونٹوں کی ہم ہنسی نہیں کہتے
کیف پا نہیں سکتے ذکر صبح روشن سے
آپ تیرگی کو بھی تیرگی نہیں کہتے
آپ کا کرم ہوگا راستے سے ہٹ جانا
کارواں فریبی کو رہبری نہیں کہتے
حسرت ستائش میں خود ستائی کرتے ہو
اپنا حال احساس کمتری نہیں کہتے
چشم لطف کا ان کی دل فریب کیوں کھاتا؟
التفات دشمن کو دوستی نہیں کہتے
فلسفوں کے پردے میں جہل چھپ نہیں سکتا
واہمے کی شوخی کو آگہی نہیں کہتے
چند غرق صہبا ہیں اور باقی سب پیاسے
ایسی بادہ خواری کو مے کشی نہیں کہتے
ہے شعور کی وسعت روح نغمہ شاعر
جہل کے ترنم کو شاعری نہیں کہتے

خون ہر کبوتر کا احترام لازم ہے
تشنگی شاہیں کو ہم خودی نہیں کہتے
داستان جور ان کی مشتہر ہے دنیا میں
وہ کبھی نہیں سنتے ہم کبھی نہیں کہتے

[۴]

پھوڑ لیں خود اپنی آنکھیں، دیدہ ور ایسے بھی ہیں
آئینے کو توڑ ڈالیں خود نگر ایسے بھی ہیں
جن کے آنسو مانگتے رہتے ہیں ہمدردی کی بھیک
مدعیان وقار چشم تر ایسے بھی ہیں
جن کا انداز رفاقت رہزنی کی آبرو
قافلے میں اپنے کتنے ہم سفر ایسے بھی ہیں
جن کی وحشت فن برائے فن کی اک تصویر ہے
اپنی محفل میں کئی آشفتہ سر ایسے بھی ہیں
راہ میں ٹھوکر لگے تو قافلے سے روٹھ جائیں
عزت افزایان خاک رہ گزر ایسے بھی ہیں
ندرت دشنام پر جن کی عدو کو رشک آئے
دوستوں میں اپنے کچھ اہل ہنر ایسے بھی ہیں
جن کے رہنے والے پتھر پھینکتے ہیں ہر طرف
رحم کے قابل یہاں شیشے کے گھر ایسے بھی ہیں
چاند سے جن کو شکایت ، جن کو سورج سے گلہ
ناقدان گردش شام و سحر ایسے بھی ہیں
آشیاں بردوش اڑتے ہیں قفس کے آس پاس
شہرت اندوزان زعم بال و پر ایسے بھی ہیں

[۵]

شب زنداں حد تنویر تک آ پہنچی ہے
صبح نو خانۂ زنجیر تک آ پہنچی ہے
توڑتی پاؤں کی زنجیروں کو آزادی شوق
سایہ زلف گرہ گیر تک آ پہنچی ہے
اے ہوس دعوت تخریب نہ دے انساں کو
زندگی سرحد تعمیر تک آ پہنچی ہے
تھی جو زندان خموشی میں مقید وہ بات
بڑھتے بڑھتے لب تقریر تک آ پہنچی ہے
بند آنکھوں میں مچلتی تھی جو رنگین خواب
اب وہ گلفامی تعبیر تک آ پہنچی ہے
نیند کی طرح اڑا جاتا ہے خود رات کا رنگ
اب نظر صبح کی تنویر تک آ پہنچی ہے
اک نئی آگ دہکتی ہے جواں سینوں میں
آنچ اب اس کی دل پیر تک آ پہنچی ہے
بند کر بربط و طاؤس و امارات کا راگ
بات اب خنجر و شمشیر تک آ پہنچی ہے
گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارت جاگیر تک آ پہنچی ہے
راہ کیا روکے گا پرویز فسون اوہام
زندگی منزل تفسیر تک آ پہنچی ہے

[۶]

عجب طرح کی دکھائی سبک روی میں نے
جنوں کے جوش میں منزل ہی چھوڑ دی میں نے

دیا ہے رنج کو پیراہن خوشی میں نے
نشان غم میں گزاری ہے زندگی میں نے
تصورات سے تشکیل حسن کرتا ہوں
صنم پرستی میں سیکھی ہے بت گری میں نے
غرور حسن تھا دریوزہ گر نگاہوں کا
تمہارے جلووں کی دیکھی تھی بے کسی میں نے
نمود حسن میں یہ شعریت خدا کی پناہ
نثار آپ پہ کی اپنی شاعری میں نے
وقار دیر بڑھا اجتماع ہمت سے
بتوں نے کی ہے خدائی ، پیمبری میں نے
بجا ہے گر مرے ایماں پہ کفر ناز کرے
حرم میں سیکھے ہیں آداب کافری میں نے
خدا بھلا کرے آنکھوں کی مسکراہٹ کا
کہ دیکھ لی ترے جلووں کی گدگدی میں نے
مرے زوال پہ ہنستے ہیں خلد والے کیوں
بنادیا تھا فرشتوں کو آدمی میں نے
تمام پھیلی حلاوت کلام شیریں کی
دکھائی نظم میں پرویز خسروی میں نے

[۷]

اگر گناہ یہی ہے کہ تجھ کو پیار کیا
تو ہاں گناہ کیا اور بار بار کیا
تری طرف سے تصور نے جب کئے وعدے
خدا گواہ ترا میں نے انتظار کیا
فضا کے دام رہ حسن و عشق ارے توبہ!
کبھی شکار ہوئے اور کبھی شکار کیا

وہ میرا گریہ پیہم وہ تیرا خندہ ناز
ترے سکوں نے بہت مجھ کو بے قرار کیا
وہ حسب وعدہ جو آئے بھی انتظار کے بعد
تو میں نے ہوش میں آنے کا انتظار کیا
زباں شریک عنایت نہ تھی تو خیر نہ ہو
تری نگاہ نے تو میرے دل کو پیار کیا
ترے کلام سے پرویز جھانکتے ہیں وہ
عجیب طرز سخن تو نے اختیار کیا

[۸]

نہ جانے کہہ گئے کیا آپ مسکرانے میں
ہے دل کو ناز کہ جان آگئی فسانے میں
نہ آسکی کوئی شے تیری یاد پر غالب
تجھی سے لوں گا مدد اب تجھے بھلانے میں
نہ جانے بنتی ہے سجدوں کی داستاں کیوں کر
کشش جبیں میں ہے یا تیرے آستانے میں
خبر بھی ہے تجھے؟ کس کس نظر کی بیتابی
ہوئی ہے صرف تبسم ترا بنانے میں
ہے بھول جانے کی کوشش بھی یاد کا اک نام
میں کامیاب کہاں ہوں تجھے بھلانے میں
ترے ہی ذوق کرم کے یہ کام آئیں گے
ادائیں صرف نہ کر میرے آزمانے میں
خزاں سے مانگوں کا اب داغ دل کی شادابی
بہار باغ تو ہے محو گل کھلانے میں

معاف کر کبھی پرویز کو نہ اے غم دوست!
کہ رو دیا ہے یہ اکثر غزل سنانے میں

[۹]

دل میں مرے خیال ہے تنہا نہ آپ کا
میخانہ بنتا جاتا ہے پیمانہ آپ کا
جانا کوئی ضرور نہیں ماورائے ارض
آخر یہیں کہیں تو ہے کاشانہ آپ کا
رگ رگ میں بھرتے جاتے ہیں شعلے حیات کے
خود شمع بنتا جاتا ہے پروانہ آپ کا
دل بن رہا ہے شانہ گیسوئے روزگار
اب میرے سر میں رہتا ہے سودانہ آپ کا
رنگیں بنا دیا ستم روزگار نے
بے رنگ ہو چلا تھا کچھ افسانہ آپ کا
زنجیریں ٹوٹی جاتی ہیں زور بہار سے
اب رقص کرنے والا ہے دیوانہ آپ کا

[۱۰]

ہے ضبط گریہ وجہ اضطراب مستقل دل میں
تماشا ہے کہ دریا پرورش پاتا ہے ساحل میں
محبت کا جنوں اور وہ بھی اس دنیائے باطل میں
گہر کی جستجو میں کر رہا ہوں ریگ ساحل میں
جوانی وہ بھی غربت کی جوانی ہائے کیا کہئے
کسی نے بھر دیا پگھلا کے سونا چشم سائل میں
بڑا دھوکا دیا پرویز نے شیریں نوائی سے
کہ سب کہتے ہیں اس کو کامیاب عشق محفل میں

[۱۱]

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا
کم سے کم میں غم دنیا کو بھلا سکتا تھا
پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا
اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا
تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غم ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا
میں نے دیکھاہے ترے حسن خودآگاہ کارعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا
وہ تری سرخی عارض کے قریب آ نہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خون جگرنے نہ دیا
حسن ہمدرد ترا ہم سفر شوق رہا
مجھ کو تنہاکسی منزل سے گزرنے نہ دیا
کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

[۱۲]

سنا ہے ان کے لب پر کل تھا ذکرمختصر میرا
تصور دے رہاہے طول اسی کو کس قدر میرا
یہ دل سوزی درد آدمیت کیا قیامت ہے
کسی کی آنکھ سے آنسو بہیں دامن ہو تر میرا
تصورمیکدے کامشترک ہوکس طرح ناصح؟
خرد ساغر شکن تیری ، جنوں پیمانہ گر میرا

یہی عالم رہا گرشوق کی آئینہ بندی کا!
توگم ہوجائے گا جلووں میں شوق خودنگر میرا
خدارا کچھ تو ناز سربلندی رحم کر مجھ پر
ترے بارگراں سے اب جھکاجاتاہے سرمیرا
الجھ کررہ گئی تھی عقل توپردے کے تاروں میں
بڑی مشکل سے کام آیاجنون پردہ در میرا
نہیں پرویز کچھ اپنے ہی اشکوں کی نمی اس میں
بنا ہے آستین دوستاں دامان تر میرا

[۱۳]

نپٹیں گے دل سے معرکۂ رہ گزرکے بعد
لیں گے سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد
اٹھنے کو ان کی بزم میں سب کی نظر اٹھی
اتنا مگر کہوں گا کہ میری نظر کے بعد
سب زور ہو رہا ہے مری سرکشی پہ صَرف
کیا ہوگا حال دار و رسن میرے سرکے بعد
کوئے ستم سے گزریں توشوریدہ گان عشق
ہنسنے لگیں گے زخم جگر زخم سر کے بعد
برق ستم کی نذر کروں بھی توکیاکروں
اب کیا رہا ہے آگ لگانے کو گھرکے بعد
بے خواب کر رہے ہیں شب غم کے مرحلے
آنکھیں جھپک نہ جائیں طلوع سحرکے بعد
ہوگا طویل اور بھی افسانہ وفا
اہل جفا کے طعنۂ مختصر کے بعد

[۱۴]

جب تک شریک حال کسی کی نظر نہ تھی
تھی زندگی حسین مگر اس قدر نہ تھی
وہ چشم سرمگیں جو بظاہر ادھر نہ تھی
دل ہی سے ہم کلام تھی اس کی خبر نہ تھی
میں خود حجاب دوست سے محجوب ہوگیا
ورنہ حکایت غم دل مختصر نہ تھی
اب حسن لے رہا ہے وفاؤں کا جائزہ
پہلے مری حدیث وفا معتبر نہ تھی
اکسا رہی ہے آج فضا التفات کی
کل تک حیات کو ہوس بال و پر نہ تھی
اب کاروان گیسو و عارض میں ہوں شریک
پہلے یہ خوش سلوکی شام و سحر نہ تھی
اب ہم نوا ہیں اس دل نازک کی دھڑکنیں
پہلے خود اپنے دل کی تڑپ نغمہ گر نہ تھی
اب اپنے غم کدے میں بھی لگنے لگا ہے جی
پہلے یہ خوش مزاجی دیوار و در نہ تھی
تھا جادۂ حیات پہ کل بھی سفر یہی
لیکن کوئی امنگ شریک سفر نہ تھی

[۱۵]

دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے
ماہ و خور اگانے ہیں ، کہکشاں بنانا ہے
اے زمیں! تجھی کو اب آسماں بنانا ہے

شوق کے تسلسل کو داستاں بنانا ہے
اک جہاں مٹانا ہے اک جہاں بنانا ہے
ہیں مرے تصور میں ان کے سرخ رخسارے
اور انہیں سے دنیا کو گلستاں بنانا ہے
گل فروش تھا مالی ، ہوگیا چمن خالی
آج پتے پتے کو باغباں بنانا ہے
اپنے سرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو
بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے
باندھ کر کفن سر سے یوں کھڑا ہوں مقتل میں
جیسے سرفروشوں کا کارواں بنانا ہے
میری زندگی میں تم اپنی دلکشی بھر دو
وقت جیسے ظالم کو مہرباں بنانا ہے
آج ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہیں تلواریں
دل کی آرزوؤں کو سخت جاں بنانا ہے

[۱۶]

چھپ کر نہ رہ سکے نگہ اہل فن سے ہم
محفل میں جھانکتے ہیں نقاب سخن سے ہم
کمبخت ڈھونڈتی ہے محبت میں فلسفہ
تنگ آگئے ہیں عقل کے دیوانہ پن سے ہم
تلخی زندگی میں بھی پانے لگے مٹھاس
عاجز ہیں اپنی فطرت کام و دہن سے ہم
پیدا کیا ہوا ہے ہمارا ہی سب فروغ
بیگانہ کچھ نہیں ہیں تری انجمن سے ہم

اے محو ناز اور نیا کوئی امتحاں
اکتا گئے ہیں بازی دار و رسن سے ہم
اک ذرہ ہی سہی مگر اے آفتاب ناز
سجدے کرا رہے ہیں تری ہرکرن سے ہم
دیتے رہے فریب مناظر کے بت کدے
دیکھا کئے تجھے نگہ بت شکن سے ہم
اٹھنا ہمارا تھا کہ سبھوں کی نظر اٹھی
کچھ جیسے لے چلے ہوں تری انجمن سے ہم
ابھرا نہیں ہے سادگی گریہ کا مذاق
محفل یہ چاہتی ہے کہ روئیں بھی فن سے ہم

[۱۷]

یہ صف حشمت مآبوں کی، یہ صف عالی جنابوں کی
تمہاری انجمن خلوت بنی ہے باریابوں کی
ہوائے تند میں یہ ریشمی خیمے نہ ٹھہریں گے
کہاں تک آزماؤگے وفاداری طنابوں کی
یہ ہے شہر ’ہوس‘ پہچانا مشکل ہے لوگوں کا
یہاں چہرے بھی بکتے ہیں دکانوں میں نقابوں کی
ہمارے پیچھے پیچھے کیوں پھرو سیارہ سیارہ
تمہیں تو صرف قبریں کھودنی ہیں آفتابوں کی
ذرا سوچو تو بام ارتقا تک اڑ کے پہنچوگے؟
تُلے ہو توڑنے پر سیڑھیاں کیوں انقلابوں کی
بنانا چاہتے ہو ’خواب بیداری‘ کو فن اپنا
ضرورت تھی اندھیروں کو تمہیں ’آشفتہ خوابوں‘ کی

نہ جانے درس گاہوں کو کہاں پہنچا کے دم لے گی
یہ تعلیمی کج اندیشی، یہ بے سمتی نصابوں کی

[۱۸]

جلتے رہنا کام ہے دل کا بجھ جانے سے حاصل کیا
اپنی آگ کے ایندھن ہیں ہم، ایندھن کا مستقبل کیا
بولو نقوش پا کچھ بولو، تم تو شاید سنتے ہو
بھاگ رہی ہے راہ گزر کے کان میں کہہ کر منزل کیا
ڈوبنے والو! دیکھ رہے ہو تم تو کشتی کے تختے
دیکھو دیکھو غور سے دیکھو دوڑ رہا ہے ساحل کیا
اَن پڑھ آندھی گھس آتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
’اندر آنا منع ہے‘ لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا
قتل وقار عشق کا مجرم جہل ہوس کاراں ہی نہیں
ننگے اس حمام میں سب ہیں، عالم کیا اور جاہل کیا
پروانے اب اپنی اپنی آگ میں جلتے رہتے ہیں
شعلوں کے بٹوارے سے تھا مقصد شمع محفل کیا
ٹوٹی دھنک کے ٹکڑے لے کر بادل روتے پھرتے ہیں
کھینچا تانی میں رنگوں کی سورج بھی ہے شامل کیا

[۱۹]

راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حد نظر سے آگے بھی
ہم سفری و راہبری میں حد فاصل کوئی نہیں
شام و سحر کے ساتھ بھی ہم ہیں شام و سحر کے آگے بھی
سوچ سمجھ کر اہل نظر نے شعلوں کی دنیا کو چنا
ورنہ نشیمن بن سکتا تھا برق و شرر سے آگے بھی

دل کا تعاقب کرتے کرتے ہانپ رہی ہے سعی ستم
دارورسن کیا جاسکتے ہیں گردن و سر سے آگے بھی
بربط ودف کی دنیامیں بھی شام وسحررن پڑتا ہے
دیکھونکل کر اپنے جہان تیغ وسپر سے آگے بھی
وہم مسافت کے صحرامیں سائے سائے چلتے ہیں
چاندستارے چل کے دکھادیں فکربشر سے آگے بھی
بھول ہوئی، کیوں آنسوبن کررہ گیامیری پلکوں تک
خون جگر تو جاسکتا تھا دیدۂ تر سے آگے بھی

[۲۰]

خاموشی بحران صدا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
سناٹاسا چیخ رہا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
ترک تعلق کرکے زباں سے دل کا جینا مشکل ہے
یہ کیسا آہنگ وفا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
دل والوں کی خاموشی ہی بارسماعت ہوتی ہے
بے آوازی کرب فضا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
بھیس بدلتی آوازیں ہی شام و سحر کہلاتی ہیں
وقت کا دم کیا ٹوٹ گیا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
سکتے تک اب آپہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کرب سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
کیسی نرمی ، کیسی سختی ، لہجے کی کیا بات کریں
فکر ہی اب گم کردہ صدا ہے تم بھی چپ ہوہم بھی چپ
جب تک راہ وفا تھی سیدھی زور بیاں تھا عیش سفر
شاید کوئی موڑ آیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

منتخب نظمیں

رقص حیات

جب بزم ارتقا میں جلی شمع زندگی
تھی روشنی میں شان حجاب عروس کی
گونجی فضائے شوق میں شعلوں کی راگنی
جو بڑھ کے دوسری نئی تانوں میں ڈھل گئی
ہر لو نئی لووں کو جگاتی چلی گئی
زنجیر روشنی کی بناتی چلی گئی

تمثیل خلد و آدم و حوا بنی حیات
افسانہ لطافت دنیا بنی حیات
تاریخ عشق و حسن خود آرا بنی حیات
تخلیق کا لطیف سہارا بنی حیات
فطرت بجائے جاتی ہے ساز التفات کا
رکتا نہیں ہے رقص تسلسل حیات کا

تاریخ کائنات میں بدلا کئے نظام
ہر دور تازہ آیا لیے اک نیا پیام
کچھ کچھ بڑھا بھی حسن و محبت کا احترام
اب تک مگر یہاں ہے محبت جنون خام

رہتی ہیں سہمی سہمی امنگیں شباب کی
صورت نہاں ہے زندگی کامیاب کی
خطے اسی جہان میں ایسے بھی ہیں مگر
رقصاں ہے جن کے ساز پہ اب عظمت بشر
جو جھومتے ہیں حسن و محبت کے نام پر
ہے جادۂ شباب جہاں جنت سفر
گاتے جہاں ہیں لوگ ترانے نئے نئے
بنتے جہاں ہیں روز فسانے نئے نئے
تعمیر کے یہاں بھی پرافشاں ہیں ولولے
رگ رگ میں بن کے خون خراماں ہیں ولولے
ساز بہار نو پہ غزل خواں ہیں ولولے
معمار تازگی گلستاں ہیں ولولے
سرخی بتا رہی ہے رخ کائنات کی
جنت یہاں بھی بن کے رہے گی حیات کی
انعام آرزوئے برادر ، نشاط جاں!
تسکین روح ، عیش تمنائے خانداں!
شادی تمہاری مژدۂ تعبیر گلستاں
خواب بہار تازہ کی تعبیر کامراں
وجد آفریں ترانۂ ساز خیال ہے
ایسے میں ضبط جوش مسرت محال ہے
ہے جادۂ حیات مسرت لیے ہوئے
ہے ہر قدم شباب کا ، جنت لیے ہوئے

گردن اٹھاؤ عزم محبت لیے ہوئے
ہمت کرو نشاط رفاقت لیے ہوئے
منزل بھی اس جہان میں ہے رہ گزر بھی ہے
بڑھتے چلو کہ کوئی رفیق سفر بھی ہے
تم دونوں ساز وقت پہ گاتے ہوئے چلو
دنیا کو نغمہ زار بناتے ہوئے چلو
کانٹوں کو راستے سے ہٹاتے ہوئے چلو
ہاں ہر قدم پہ پھول کھلاتے ہوئے چلو
بھر دو نئی امنگوں سے آنچل حیات کا
تم دونوں پر بھی قرض ہے کچھ کائنات کا
کبریٰ مری عزیز بہن ، دل کی روشنی!
ماں جائے کا غرور ، بھرے گھر کی لاڈلی!
اترا رہی ہے روح کہ تم ہو دلہن بنی!
دل میں مچل رہی ہے مسرت کی راگنی
کب دور ہوں بہار طرب آفریں سے میں
سہرے کے پھول سونگھ رہا ہوں یہیں سے میں
ہے زندگی کے راستے پر یہ سفر نیا
تم جا رہی ہو آج بسانے کو گھر نیا
جلوے نئے ہیں وقت کے ذوق سفر نیا
سسرال پر پڑے گا تمہارا اثر نیا
بے تاب جذب شوق ہے اظہار کے لیے
لے جاؤ رونقیں در و دیوار کے لیے

تعمیر زندگی کے طریقے نکالنا
میخانہ حیات میں ساغر اچھالنا
سانچے میں صبح نو کے زمانے کو ڈھالنا
دل کو سنبھالتے ہوئے آنچل سنبھالنا
ہر ذرہ ہے نشاط تمنا لیے ہوئے
آگے بڑھو خوشی کا پھریرا لیے ہوئے

تثلیث حیات

انگلیاں میری ہیں لب میرے ہیں آنکھیں میری
میری پیشانی کا ٹکڑا تری پیشانی ہے
ننھی ننھی یہ بھنویں تیری ہیں یا میری ہیں
تیری رگ رگ میں مرے خون کی جولانی ہے
دست و پا میں جو یہ کیفیت سیمابی ہے
میری ہی روح کی بکھری ہوئی بیتابی ہے
اپنے شعروں میں جڑے روح کے ٹکڑے کتنے
اپنے افکار کو خوں دل کا پلا کر پالا
بھر دی ہر لفظ میں شخصیت رنگیں اپنی
اپنے ہی سانچے میں انداز بیاں کو ڈھالا
میرا فن بھی مری تصویر کی تکمیل نہیں
کوئی تجھ سا مرے اجمال کی تفصیل نہیں
تجھ کو اپنے ہی خدوخال تری ماں نے دئے
اپنا شاداب چمکتا ہوا چہرہ بخشا

خلوت بطن میں ہر طرح سنوارا تجھ کو
پیکر حال کو خون رگ فردا بخشا
تجھ کو بخشی ہے تری ماں نے لطافت اپنی
دیکھتی ہے ترے آئینے میں صورت اپنی
گرہ رشتہ پیمان وفا تیرا وجود
تجھ سے مضبوط ہوا عہد محبت اپنا
ہاتھ میں ہے مرے دل کے، دل محبوب کا ہاتھ
کتنا بشاش ہے احساس رفاقت اپنا
خستگی شوق کی اب تازہ دمی تک پہنچی
راحت ہم سفری ہم قدمی تک پہنچی
ماں نے موسم کے بدلتے ہوئے تیور بھانپے
انگلیوں نے مری ، کیں نبض ہوا سے باتیں
ایک لمحہ بھی نہ چپکے سے گزرنے پایا
دن تو دن آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی ہیں راتیں
آج کی طرح تمنا کبھی بیدار نہ تھی
اتنی دلچسپ تو کل وقت کی رفتار نہ تھی
گرچہ ہے سخت بہت معرکہ نشو و نما
مامتا صرف سپر ہی نہیں تلوار بھی ہے
میری شفقت بھی تری جہد بقا میں ہے شریک
دل جری ہی نہیں، کچھ واقف پیکار بھی ہے
ذہن میں سلسلہ شام و سحر رہتا ہے
تیرا انداز سفر پیش نظر رہتا ہے

یہ تضادات مسلسل ، یہ ستیز پیہم
یہ تصادم ، یہ ہم آویزی اضداد حیات
ساز سے ہے رم آواز ، یہ ربط آواز
زندگی کا یہ تسلسل ، یہ تغیر ، یہ ثبات
روح تخلیق خفی کو بھی جلی کرتی ہے
ہے یہ ثابت کہ نفی اپنی نفی کرتی ہے
نفی و اثبات کے تاروں کا مسلسل ٹکراؤ
زندگی کی جدلی زمزمہ پردازی ہے
کائنات اتنی خوش آہنگ جو آتی ہے نظر
عمل و ردعمل ہی کی نوا سازی ہے
حسن معنی ہے یہی ، جلوۂ صورت ہے یہی
نغمہ ہی نغمہ ہے ، ہرشے کی حقیقت ہے یہی
حسن اور عشق کا یہ جذبہ خود افزائی ہی
اک نئے پیکر معصوم میں ڈھل جاتا ہے
اسی پیکر سے ابھرتا ہوا نقش تثلیث
اپنی وسعت میں جہاں ساز نظر آتا ہے
محفل حسن و محبت اسی تثلیث میں ہے
جلوہ گر شاہد فطرت اسی تثلیث میں ہے
کتنی دلکش ہے خوش امکانی تثلیث حیات
اس کی فطرت ہے خود افراز و خود آرا ہونا
وسعت جلوہ سے ہے حسن کی تکمیل شباب
قسمت ذرہ ہے آئینہ صحرا ہونا

زندگی مست وغزل خواں ہے خود آرائی سے
ہر کلی جان گلستاں ہے خود آرائی سے
باپ ماں بچے کی فطری سہ رخی وحدت سے
کنبے انسانوں کے تثلیث کی صورت پھیلے
کثرت آرائی فطرت کا یہی مقصد ہے
حسن دنیا میں پھلے پھولے ، محبت پھیلے
اور ابھی روشنی مہر مبیں پھیلے گی
گود میں لے کے ستاروں کو زمیں پھیلے گی
تیری معصوم صدا سے مترنم ہے شعور
علم و حکمت کو بھی موسیقی جذبات ملی
دھڑکنیں دل کی خوش آوازی افکار بنیں
ذہن کو بربط احساس کی سوغات ملی
ساز ادراک میں نغموں کا تلاطم ہے آج
عقل بے لحن ترنم ہی ترنم ہے آج
سرو قد مجھ کو نظر آتے ہیں ننھے پودے
بڑھ رہا ہے مرا دل بھی ترے قامت کے ساتھ
سامنے آنکھوں کے رہتے ہیں کروڑوں غنچے
جیسے ہر پھول کھلے گا تری صورت کے ساتھ
تجھ سے اے جان پدر! میں نے نظر پائی ہے
ساری دنیا مرے پہلو میں سمٹ آئی ہے
تیری سانسوں سے پگھل کر مرے اعصاب کا موم
سختی آہن و فولاد کو شرماتا ہے
جب ترے ننھے سے پیکر کو اٹھا لیتا ہوں
بار آلام سبک مجھ کو نظر آتا ہے

ہے کھلونا غم دنیا مجھے معلوم نہ تھا
میرے بازو ہیں توانا ، مجھے معلوم نہ تھا

رخ امروز پہ کیوں ہو غم فردا کا غبار
حال کو میرے مبارک ترا ماضی ہونا
نیستی میرے تصور میں نہیں آسکتی
تیری ہستی کو ہے بڑھ کر مری ہستی ہونا

تو مری روح ، مرا جسم ہے ، میرا دل ہے
تیرے چہرے سے درخشاں مرا مستقبل ہے

میری آنکھوں کو اگر بند بھی کردے گی تھکن
تازہ دم ہوکے تری آنکھوں سے جھانکوں گا میں
چاک ہو جائے گا جب جامہ ہستی میرا
دھجیاں اپنی تری سانسوں سے ٹانکوں گا میں

ذہن احباب میں ہے جامہ دری فطرت کی
ہے مرے پیش نظر بخیہ گری فطرت کی

میرے جذبات و خیالات، مرے محسوسات
ان کے رخساروں پہ اب پہلی سی زردی نہ رہی
تو نے بخشی ہے وہ صحت مری شخصیت کو
دل کے لرزے نہ رہے، ذہن کی سردی نہ رہی

اتنا شاداب کبھی چہرۂ کردار نہ تھا
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ میں بیمار نہ تھا

مہر ہی مہر نہیں فطرت آشفتہ مزاج
عشوۂ لطف بھی ہے ، شوخی بے داد بھی ہے
زندگی سوز ہیں آفات سماوی بھی بہت
کچھ ہوس ناک زمیں والوں کی ایجاد بھی ہے

باغ میں آگ کی جس وقت گھٹا چھاتی ہے
منہ سے پھولوں کے بھی بارود کی بو آتی ہے

ہے ادھر باغ میں صرصر تو ادھر باد نسیم
کتنا دکھ جھیل کے کلیاں گل تر بنتی ہیں
گلستاں سوز سیاست بھی ہے غمخوار سموم
ڈالیاں رقص گہہ برق و شرر بنتی ہیں

دور صحرا میں بھی جب گرم ہوا چلتی ہے
دل لرزتا ہے کہ گلشن کی چتا جلتی ہے

دُر خوش آب تو بن جاتی ہے پانی کی بوند
مرحلے سخت ہیں تکمیل سفر ہونے تک
'دام ہر موج میں ہے حلقہ صدکام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'

آب پانی کی صدف میں کبھی لہراتی ہے
ابر نیساں کی کبھی جیب کتر جاتی ہے

اے مرے پیکر نو! اے مری روح پکار!
پرچم عزم مرا اب تجھے لہرانا ہے
میری آواز نہیں میرے لبوں تک محدود
تیرے ہی ہونٹوں سے اب مجھ کو رجز گانا ہے

ہے یہی جہد نمو جنگ مسلسل میری
تیری تکمیل میں ہے فتح مکمل میری

دعوت

میں اپنے ہونٹوں پہ شعلے بجھا کے جاؤں گا
ہر ایک سانس میں بجلی چھپا کے جاؤں گا

نظر کو شمع فروزاں بنا کے جاؤں گا
ضرور جاؤں گا اور سر اٹھا کے جاؤں گا
دیار دار و رسن نے مجھے بلایا ہے

کچھ اور کس لوں رباب ہنر کے تاروں کو
بنالوں تیغ بکف اپنے فکر پاروں کو
زرہ پہنالوں شفق ریز استعاروں کو
سجالوں فوج کی صورت حسیں اشاروں کو
کہ قتل گاہ سخن نے مجھے بلایا ہے

نہ فکر جیب کی باقی نہ ہوش دامن کا
یہ سیتے رہتے ہیں بس شامیانہ مدفن کا
سمجھ رہے ہیں کہ تاجر ہوں تار وسوزن کا
ہے میتوں کو چھپانا ہی مدعا فن کا
رفوگران کفن نے مجھے بلایا ہے

بنایا جائے گا ممتاز میہماں مجھ کو
دکھائے جائیں گے الطاف میزباں مجھ کو
سنائی جائیں گی بے کیف تالیاں مجھ کو
ملے گا کاغذی پھولوں کا ارمغاں مجھ کو
عدوئے سرو وسمن نے مجھے بلایا ہے

بساط عزم کے ہر گھر کو دیکھنا ہوگا
تمام نقشوں میں بہتر کو دیکھنا ہوگا
خود اپنے مہروں کے لشکر کو دیکھنا ہوگا
ہر ایک چال کو ، تیور کو دیکھنا ہوگا
کہ شاطران کہن نے مجھے بلایا ہے

جہان شوق میں رقصاں ہے آج گلناری
مرے کلام کو ہے ناز لالہ رخساری
ہے مصر فکر میں ہر وقت گرم بازاری
ہے میرے شعروں پہ اک رنگ یوسفی طاری
فضائے گرگ دہن نے مجھے بلایا ہے

یہ امتحاں ہے مرے عزم نغمہ خوانی کا
نوائے تلخ کا ، بے باک گل فشانی کا
یقین دل کو ہے یاروں کی قدردانی کا
عوام بیڑا اٹھائے ہیں میزبانی کا
بلا سے دشمن فن نے مجھے بلایا ہے

سازِ مستقبل

کتنے اصنام ناتراشیدہ　　پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں
کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل　　ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ　　ابھی پردے میں مسکراتے ہیں
ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے　　دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں
بے جلائے ہوئے دیئے کتنے　　رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں
کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل؟
آج لمحات گنگناتے ہیں

بنت ہمالہ

آہ گنگا! یہ حسیں پیکر بلور ترا
تیری ہر موج رواں جلوۂ مغرور ترا

جور مغرب سے مگر دل ہے بہت چور ترا
جھانکتا ہے ترے گرداب سے ناسور ترا
ظلم ڈھائے ہیں سفینوں نے ستم گاروں کے
زخم اب تک ترے سینے میں ہیں پتواروں کے

محو رہتے تھے ستارے تری مے پینے میں
چاند منہ دیکھتا تھا تیرے ہی آئینے میں
خلوت مہر درخشاں تھی ترے سینے میں
تری تابانیاں آتی نہ تھیں تخمینے میں
آج روتی ہے مگر تیری جوانی تجھ کو
کھا گیا آکے یہاں ''ٹیمز'' کا پانی تجھ کو

آہ اے کوہ ہمالہ کے غرور سیال
تیری موجوں میں جمال اور ترے طوفاں میں جلال
تیرے دامن پہ کبھی بیٹھی نہ تھی گرد ملال
منہ ترا پونچھتا تھا چاند کا سیمیں رومال
زخم سینے پہ لیے آج ہیں دھارے تیرے
اف کہاں ڈوب گئے چاندستارے تیرے

ریگ دوزخ کو چھپائے ہے قبا کے اندر
ہولناک آج ہے کتنا یہ دہکتا منظر
شام ہی شام نظر آتی ہے کیوں ساحل پر
کیوں تری موجوں سے چھنتے نہیں انوار سحر
روشنی کیوں ہوئی جاتی ہے گریزاں تجھ سے؟
کیوں اندھیروں کے ہیں لپٹے ہوئے طوفاں تجھ سے؟

آج ساحل پہ نظر آتی ہے لپٹی ہوئی آگ
آدمیت کا سلگتا ہے ہواؤں میں سہاگ
آج ہے ساز سیاست کا بھیانک سا راگ
پھن اٹھائے ہوئے بل کھاتے ہیں شعلوں کے ناگ
آج انسان کو ڈستی ہیں ہوائیں تیری
زہر سے کتنی ہیں لبریز فضائیں تیری

آئی ہے ٹیمز سے اک موج رواں گاتی ہوئی
تجھ کو آزادی کے پیغام سے بہلاتی ہوئی
روح میخانہ لیے شوق کو بہکاتی ہوئی
ناز کرتی ہوئی ، ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی
لاکھ الجھا کریں زلفوں میں الجھنے والے
اس کے عشووں کو سمجھتے ہیں سمجھنے والے

لیکن اے بنت ہمالہ! تری عظمت کی قسم
سیل کے سانچے میں ڈھالی ہوئی رفعت کی قسم
تیرے جلووں کی قسم، تیری لطافت کی قسم
تیری موجوں سے ابھرتی ہوئی ہمت کی قسم
اب تری آنکھوں کو نمناک نہ ہونے دیں گے
دامن ناز ترا چاک نہ ہونے دیں گے

بے چہرگی

ہزار پوست استخواں
ہزار لب فسردگی
ہزار پردہ تشنگی
ہزار حیلہ بے دلی

ہزار عشوہ خود سری
ہزار غمزہ عاجزی
ہزار پیچ آگہی
ہزار عقدہ ابلہی
ہزار لہجہ خامشی
ہزار مرگ زندگی
غرور برتری کے ساتھ اختلاج کم تری!
یہ پارہ پارہ آدمی
یہ ریزہ ریزہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
معاشیات حرص کا ابلتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے
نظام بے مہار کا عظیم شاہکار ہے
ہزار چہرہ آدمی
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں
ابھی یہاں
ابھی وہاں
نہ کوئی سمت ذہن میں
نہ کوئی راہ سامنے
فقط فریب کاری انا کی گرد اوڑھ کر
کبھی ہے دوڑتا اِدھر
کبھی ہے بھاگتا اُدھر
ہو کون اس کا ہم سفر؟

خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ کھو گیا
دوبارہ وہ ملے گا کیا؟
تعاون آئینہ کا بھی فریب ہی فریب ہے
نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہے
خود اپنے چہروں کا ہجوم ورطہ نگاہ ہے!
نہ کوئی نقش منفرد
نہ کوئی عکس معتبر
ہزار چہرہ آدمی
ہزار چہرگی لیے
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو......
چہرہ چاہیئے
خود اپنا چہرہ چاہیئے
وہ اصلی چہرہ چاہیئے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں!

شمع سر بازار

میں ہوں شمع سر بازار، روشن ہے جہاں مجھ سے
رفیق رونق پیہم ہوس کی ہے دکاں مجھ سے
نوید سوز آگینی ہے میری شعلہ سامانی
لپٹ جاتا ہے ہر پروانۂ آتش بجاں مجھ سے
فروغ کاروبار شوق ہے میری جگر سوزی
سب آ کر مول لیتے ہیں دلوں کی گرمیاں مجھ سے

بھڑک کر آگ میری ولولوں کا دل بڑھاتی ہے
جلاتا ہے چراغ اپنا شباب سرگراں مجھ سے
مری لو سے پتنگے کھیلتے ہیں بے قرارانہ
دلوں کا سوز رہتا ہے ہمیشہ کامراں مجھ سے
گداز قلب آتا ہے تپش اندوز ہوتا ہے
نہیں محروم رہتا کرمک افسردہ جاں مجھ سے
ہوس کے آسماں پر ابر تسکیں بن کے چھاتا ہے
کبھی بھی رائیگاں ہوتا نہیں اٹھ کر دھواں مجھ سے
پناہ خلوت فانوس سے ناآشنا ہوں میں!
ہیں ہردم پنجہ کش حرص وہوس کی آندھیاں مجھ سے
تصادم رک گیا پروانے کا اور شمع خلوت کا
لیا تقدیر نے کار حجاب درمیاں مجھ سے
مرے انداز خاموشی میں ناز دل فریبی ہے
کیا جاتا نہیں حال جگر سوزی بیاں مجھ سے
تمدن کے رخ افسردہ کو شاداب کرتی ہوں
نہ پوچھو کس طرح پابندی آداب کرتی ہوں

تحقیر تحفہ

مانا کہ ہیں سونے سے لکھے جانے کے قابل
پرویز کے اشعار مگر زر تو نہیں ہیں
وہ ہوں فلک علم کے اک نیر تاباں
دولت میں مگر میرے برابر تو نہیں ہیں
وہ فکر میں ہوں رشک ارسطو بھی تو کیا ہے
اعزاز میں ہم چشم سکندر تو نہیں ہیں

کرتے ہیں وہ تقدیر کا ماتم بہت اچھا
پر نغمہ گر اوج مقدر تو نہیں ہیں
موتی سے بھی کچھ بڑھ کے سہی آب میں اشعار
قیمت میں مگر موتی سے بڑھ کر تو نہیں ہیں
مرعوب ہو کیوں حسن مرا ان کی نظر سے!
اک اچھے سے شاعر ہیں وہ افسر تو نہیں ہیں
کیا آئے ہو دینے مجھے پرویز کے تحفے
اشعار ہی اشعار ہیں ، زیور تو نہیں ہیں

خوابوں کی سیڑھیاں

علم وحکمت کی یہ فلک گردی   آسماں پر یہ دشت پیمائی
یہ قدم بوسیاں ستاروں کی   ماہ تاباں کی یہ جبیں سائی

فاصلوں کا یہ مضمحل پندار   وسعتوں کے یہ منفعل تیور
یہ فضائی مزاحمت کی شکست   یہ ظفریابی نگاہ بشر

یہ شعاعوں کے سہمے سہمے تیر   یہ کشش کے لرزتے دام وکمند
خاک انجم شکار کا یہ کمال   یہ قمر افگنی فکر بلند

یہ غرور وسائل پرواز   پرفشاں گرد کا یہ ناز عروج
پستیوں کی یہ گردن افرازی   یہ شکست طلسم اوج بروج

ارتقائے شعور انساں کے   سلسلے کی حسین کڑیاں ہیں
یہ وہ لمحے ہیں جن کے سینوں میں   لاکھوں ہی ماہ وسال رقصاں ہیں

شاعران جمال آرا نے   ماہ و انجم کی پرورش کی ہے
آج کی ہرحقیقت روشن   کسی افسانے کی ترقی ہے

ساکنان دیار حسن خیال   شعر لکھتے ہیں گیت گاتے ہیں
دے کے ترتیب اپنے خوابوں کی   نو بہ نو سیڑھیاں بناتے ہیں

شاعران حیات ہیں ہم لوگ   ہاتھ سائنس کا بٹائیں گے
زندگی خواب دیتی جائے گی   سیڑھیاں ہم بناتے جائیں گے

شیروانی

اےاون کی چہیتی، اےسرج کی دلاری   خال رخ صنم کا تھا رنگ تجھ پہ طاری
ہرتار سے نمایاں زلفوں کی رشتہ داری   چشم سیاہ خوباں کا نقش سحر کاری
ہے یاد مجھ کو تیری گزری ہوئی جوانی
اے میری شیروانی!

تیری طلب میں دل نے کیا آفتیں اٹھائیں   سو آرزوئیں کچلیں، سوخواہشیں دبائیں
کتنی ضرورتوں کی خود دھجیاں اڑائیں   کتنے جری تقاضوں کی گردنیں جھکائیں
کتنی 'ریاضیاتی' گلیوں کی خاک چھانی
اے میری شیروانی!

کتنے 'معاشیاتی' قانون میں نے توڑے   کتنے ہی 'مالیاتی' پچھلے اصول چھوڑے
دوڑائے 'ہندسوں' کے کاغذ پہ کتنے گھوڑے   کتنے بجٹ بنائے، کتنے حساب جوڑے
کس کس کی بات ٹالی، کس کس کی بات مانی
اے میری شیروانی!

کتنے جواں ارادوں نے ہاتھ پاؤں مارے   ٹپکے مری جبیں سے کتنے حسیں ستارے
سانسوں سے میری برسے کتنے دبے شرارے   بیم ورجا کے دوزخ میں کتنے دن گزارے
جب جا کے میں نے پایا انعام جانفشانی
اے میری شیروانی!

پینتیس کا دسمبر اب تک ہے یاد مجھ کو   سرما کا رقص خنجر اب تک ہے یاد مجھ کو
ٹھنڈی ہوا کا لشکر اب تک ہے یاد مجھ کو   اپنا ٹھٹھرتا پیکر اب تک ہے یاد مجھ کو
بھولا نہیں ہوں، گرچہ ہے داستاں پرانی
اے میری شیروانی!

اس سال تو ہوئی تھی پیدا نگار سرما!   اے مشک رو حسینہ! عنبر عذار سرما!
سنبل سا اون تیرا! تھا پردہ دار سرما!   رہتی تھیں تجھ سے لپٹی شب ہائے تار سرما!
ہر صبح تھی زمستاں کی عید کامرانی
اے میری شیروانی!

یادیں ہیں تجھ سے لپٹی کتنی ضیافتوں کی   کتنے مشاعروں کی، کتنی صدارتوں کی
کتنی نوازشوں کی ، کتنی عنایتوں کی   پہلو نوازیوں کی ، تپتی محبتوں کی
تھی طرز میہمانی میں شان میزبانی
اے میری شیروانی!

کاٹے مری رفاقت میں بیس سال تونے   جھیلا عذاب باد سرد شمال تو نے
کی میرے جسم لرزاں کی دیکھ بھال تونے   رکھا ہمیشہ میرے سکھ کا خیال تو نے
لیکن بقول واعظ ''دنیا ہے دارفانی''
اے میری شیروانی!

میں بیسواں جنم دن تیرا منا رہا ہوں   پھر بخیہ و رفو کا بربط بجا رہا ہوں
پچھلی نوازشوں کے پھر گیت گا رہا ہوں   ہر چاک نو سے تیری آنکھیں لڑا رہا ہوں

دے سکتا کاش تجھ کو میں عمر جاودانی
اے میری شیروانی!

یہ سچ ہے اب رفاقت آرام چاہتی ہے — تیری مسن محبت آرام چاہتی ہے
پیر و ضعیف محنت آرام چاہتی ہے — تو جیسے زیر تربت آرام چاہتی ہے
ہے موت کا پسینہ، ماتھے کا تیرے پانی
اے میری شیروانی!

اب تو مسک مسک کر فریاد کر رہی ہے — زخم رفو سے پہلو آباد کر رہی ہے
طرز فغاں انوکھی ایجاد کر رہی ہے — مجھ کو بھی ساتھ اپنے برباد کر رہی ہے
زاہد کے جہل سے لے کچھ درس سخت جانی
اے میری شیروانی!

سن لے تو سال نو کا رنگیں پیام پیاری — کرتا ہے پھر زمستاں تجھ کو سلام پیاری
امسال بھی وفا کا چمکا دے نام پیاری — کرلوں گا پھر میں کوئی اور انتظام پیاری
حالات مانگتے ہیں تھوڑی سی مہربانی
اے میری شیروانی!

اپنی سہیلیوں کی تجھ کو خبر نہیں ہے؟ — ہمجولیوں کی حالت کیا خستہ تر نہیں ہے؟
کیا سن رسیدگی کا ان پر اثر نہیں ہے؟ — لاکھوں قمیصوں کرتوں پر کیا نظر نہیں ہے؟
دولت کو بے زری سے ہے بغض خاندانی
اے میری شیروانی!

ٹھٹھرے ہوئے بدن اب نعرے لگا رہے ہیں — بوسیدہ پیرہن اب نعرے لگا رہے ہیں
یاران انجمن اب نعرے لگا رہے ہیں — نادار اہل فن اب نعرے لگا رہے ہیں
ہے چند دن کی مہماں جاڑوں کی حکمرانی
اے میری شیروانی!

منتخب رباعیات

[۱] صہبائے نشاط انجمن لایا ہوں
پیمانۂ لطف اہل وطن لایا ہوں
اے تشنہ لبان بزم دیکھو دیکھو
میخانۂ بادۂ سخن لایا ہوں

[۲] پیمانۂ کیف دیدہ و دل بدلا
رندوں کا خیال راہ منزل بدلا
ساقی! ساقی!! نئے کٹورے ساقی!!!
بدلا ، بدلا ، مذاق محفل بدلا

[۳] ہونٹوں کو خوشی کا راگ دینا ساقی
بہتی ہوئی سرخ آگ دینا ساقی
دنیا ہے جواں مانگ رہی ہے سیندور
دینا ساقی سہاگ دینا ساقی

[۴] کیا رنگ زمین و آسماں ہے ساقی
اترا ہوا چہرۂ جہاں ہے ساقی
لو دینے لگیں وقت کے عارض جس سے
وہ بہتی ہوئی آگ کہاں ہے ساقی

[۵] لا جلد شراب سرخ و روشن ساقی
مہماں ہے دو گھڑی کا ساون ساقی
میخانے میں کون عرش سے جھانکے گا
بادل کی پڑی ہوئی ہے چلمن ساقی

[۶] ظلمت کا طلسم توڑ کر لایا ہوں
پنجہ شب کا مروڑ کر لایا ہوں
اے صبح کا نور پینے والو! دوڑو
تاروں کا لہو نچوڑ کر لایا ہوں

[۷] آباد ہے جلوۂ شراب آنکھوں میں
ضوبار ہے صبح کا شباب آنکھوں میں
ہیں بادۂ شب گیر کی بوندیں آفت
رقصاں ہیں ہزاروں آفتاب آنکھوں میں

[۸] ہر پتے میں اک دھار لیے چٹکیں گے
ہر سانس میں تلوار لیے چٹکیں گے
دہکے ہوئے فولاد کے ہیں ہم غنچے
چٹکیں گے تو جھنکار لیے چٹکیں گے

[۹] بے ہودہ قدامتیں لیے بیٹھے ہو
فرسودہ شریعتیں لیے بیٹھے ہو
ہے آج نئے نظام عالم کی تلاش
تم کل کی روایتیں لیے بیٹھے ہو

[۱۰] افکار کی جرأتوں کو ٹکرانے دو
آپس ہی میں جدتوں کو ٹکرانے دو
ٹکراؤ سے اعتدال پیدا ہوگا
ٹکرانے دو شدتوں کو ٹکرانے دو

[۱۱] لذت میں خودی کی کھو گیا ہے زاہد
اور دور خدا سے ہوگیا ہے زاہد
سنتا نہیں اب شکست مسجد کی صدا
سجدے میں کچھ ایسا سوگیا ہے زاہد

[۱۲] آنکھوں سے حجاب دو جہاں اٹھتا ہے
تقدیر سے یہ بارگراں اٹھتا ہے
سنبھلو سنبھلو شراب خوارو! سنبھلو
وہ آتش صہبا سے دھواں اٹھتا ہے

[۱۳] طوفاں میں کسی کا آسرا بے معنی
ہر چیز یہاں اپنے سوا بے معنی
آغوش تلاطم میں ہے کشتی رقصاں
ایسے میں خیال ناخدا بے معنی

[۱۴] دنیا میں سکوں خواب نظر آتا ہے
اک دولت کمیاب نظر آتا ہے
ان ڈوبنے والوں کی نہ پوچھو کہ انہیں
ساحل میں بھی گرداب نظر آتا ہے

[۱۵] کلیوں کا یہ نغمہ تبسم ہے ہے
سمجھے ہیں جس کو سکوت ہم تم ہے ہے
پھولوں کی الاپ تک نہیں سن سکتے
محرومی عرفان ترنم ہے ہے

[۱۶] شبنم کا ثبات ہے ہماری ہستی
دم بھر کی تو بات ہے ہماری ہستی
جھپکی جو نظر تو صبح ہو جائے گی
بھیگی ہوئی رات ہے ہماری ہستی

[۱۷] افسانہ شوق جاودانی پڑھ لو
ہر سطر عبارت نہانی پڑھ لو
دل جس کو سپرد لب نہیں کرسکتا
میری آنکھوں میں وہ کہانی پڑھ لو

[۱۸] برباد ہوں آباد سمجھتے ہیں مجھے
ہر رنج سے آزاد سمجھتے ہیں مجھے
دیکھو مری سعی خندہ روئی کا فریب
احباب مرے شاد سمجھتے ہیں مجھے

[۱۹] بیتاب ہے دل رونے رلانے کے لیے
آنکھوں سے لہو دل کا بہانے کے لیے
پھر بھی مجھے پاس طرب کیشی دوست
ہنسنا ہی پڑا ان کو ہنسانے کے لیے

[۲۰] پھولوں سے تصور کو بساتا گزرا
ہر سانس میں نکہت سی اڑاتا گزرا
تھی راہ حیات گرچہ کانٹوں سے بھری
پھر بھی پرویز مسکراتا گزرا

ختم شد

کتابیات

(۱) ''رقص حیات''، پرویز شاہدی، مکتبہ شاہراہ، دہلی، اپریل ۱۹۵۷ء
(۲) ''تثلیث حیات''، پرویز شاہدی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۸ء
(۳) ماہنامہ ''جدید اردو''، مدیر: پرویز شاہدی، ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۷ء
(۴) ماہنامہ ''شاعر''، بمبئی، بیاد پرویز شاہدی، شمارہ ۶، ۱۹۶۸ء
(۵) ماہنامہ ''مریخ''، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء
(۶) ''پرویز شاہدی: ایک مطالعہ'' مرتب: شکیب ایاز، ۱۹۷۲ء
(۷) ماہنامہ ''زبان وادب''، پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، فروری مارچ ۱۹۸۰ء
(۸) ''پرویز شاہدی: حیات وخدمات''، عبدالمنان، ۱۹۸۸ء
(۹) ''بازیافت پرویز شاہدی''، مرتب: رئیس انور، لیبل آرٹ پریس، پٹنہ، ۱۹۹۰ء
(۱۰) ''پرویز شاہدی: حیات اور شاعری''، ڈاکٹر طلعت قیوم، پاکیزہ آفسیٹ، پٹنہ ۱۹۹۹ء
(۱۱) 'پرویز شاہدی' (مونوگراف) علیم اللہ حالی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۲۰۰۰ء
(۱۲) ''مضامین پرویز شاہدی''، مرتبہ: فضیلت پرویز، ۲۰۰۳ء
(۱۳) 'رباعیات پرویز شاہدی'، مرتب: شاہد ساز، اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتا، ۲۰۰۴ء
(۱۴) ''تثلیث حیات'' مرتبین: مظہر امام ویوسف امام، کراچی، ۲۰۰۵ء
(۱۵) ''پرویز شاہدی'' (مونوگراف) عالم خورشید، ۲۰۰۷ء
(۱۶) ''پرویز شاہدی'' (مونوگراف) ابوذر ہاشمی، ۲۰۰۹ء
(۱۷) رسالہ ''پرواز'' کولکاتا، شمارہ ۱۰-۲۰۱۱ء
(۱۸) ''عہد ساز فنکار پرویز شاہدی''، مرتب: شاہد اقبال، دسمبر ۲۰۱۱ء
(۱۹) ماہنامہ ''سہیل''، گیا، پرویز شاہدی نمبر، اپریل ۲۰۱۲ء
(۲۰) سہ ماہی ''بھاشا سنگم''، پٹنہ، جولائی ۲۰۱۴ء تا مارچ 2015ء